Front Cover

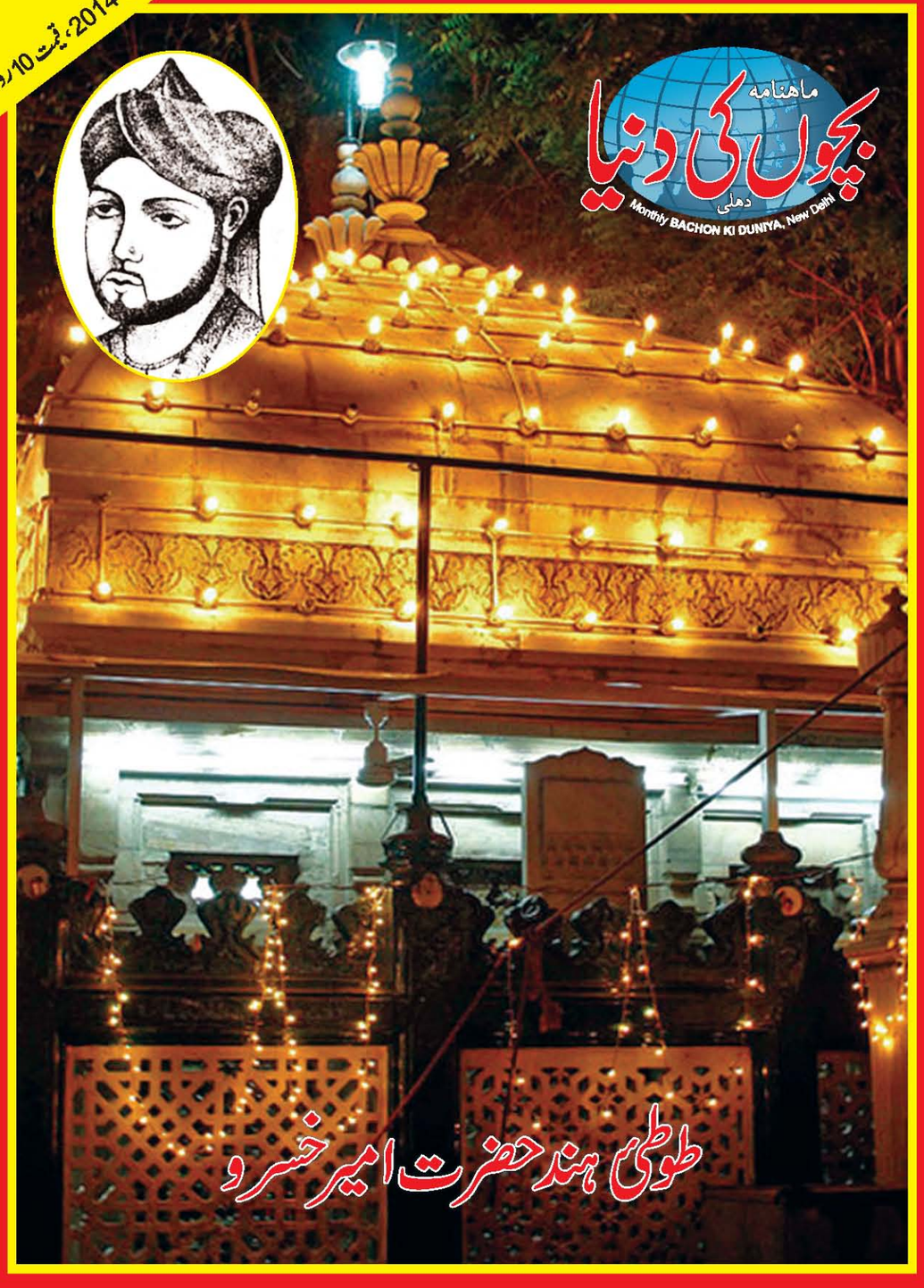

Back Cover

مارچ 2014، قیمت 10 روپے

BACHON KI DUNIYA Monthly, March 2014, Vol. 02, Issue: 03
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL (S) - 01/3439-2013-15
Date of Publication : 11/02/14
Date of Dispatch : 12 and 13 of Advance Month

اشتہار

محبان اردو کے لیے خوشخبری

- عالمی اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام 'عالمی میڈیا پرائیویٹ لیمیٹیڈ' کا قیام
- اردو میں پاکٹ بکس کا احیاء۔
- ارزاں ترین قیمتوں پر اعلیٰ اور معیاری کتابوں کی فراہمی

عالمی اردو ٹرسٹ (جو پچھلے دس سال سے اردو زبان وادب کے فروغ وترویج کے لیے بے لوث طریقے سے سرگرم ہے) کے مشاہدے میں یہ تکلیف دہ حقیقت آئی کہ اردو کتابوں کی ریڈرشپ کم ہوتی جارہی ہے۔ اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اردو کتابوں کی قیمتیں عام آدمی کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے ایک بڑے اشاعتی ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا گیا جو اب **عالمی میڈیا پرائیویٹ لیمیٹیڈ** کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد اردو کے کلاسیکی، عصری اور بچوں کے ادب کی تمام کتابیں ارزاں ترین قیمتوں پر فراہم کرنا ہے۔ ادارہ نے پاکٹ بکس...... جو کسی زمانے میں عام قاری کی ادب سے وابستگی کا بہت بڑا ذریعہ ہوا کرتی تھیں لیکن عرصہ دراز سے معدوم ہیں...... کا بھی احیاء کیا ہے۔ پاکٹ بکس اسکیم کے تحت شائع ہونے والی ادب عالیہ کی کتابوں کی قیمت محض بیس روپے (Rs.20) مقرر کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نارمل سائز کی کتابیں بھی بازار کی قیمتوں سے نصف پر دستیاب ہوں گی نیز کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اردو نصاب کی تمام کتابیں تقریباً ایک تہائی قیمت پر فراہم کی جائیں گی۔

یہ خبر بھی محبان اردو کے لیے خوشی کا باعث ہوگی کہ عالمی اردو ٹرسٹ کی طرف سے ایک سہ ماہی ادبی مجلّہ بعنوان **"عالمی جائزہ"** شروع کیا جارہا ہے جس کا پہلا شمارہ (جنوری-مارچ 2014) 15 فروری 2014 کو عالمی کتاب میلہ نئی دہلی کے موقع پر شائع کیا جائے گا۔ واضح ہو کہ عالمی میڈیا پرائیویٹ لیمیٹیڈ مالی منفعت کے لیے نہیں بلکہ اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی فرد، غیر کاروباری یا تعلیمی ادارہ ہم سے بلا کسی شرط ارزاں ترین قیمت پر ہماری شائع کردہ کتابیں براہ راست طلب کر سکتا ہے۔

عالمی کتاب میلہ نئی دہلی (15 تا 23 فروری 2014) میں ہمارے اسٹال نمبر 109 (ہال نمبر 14) پر آپ کا پرخلوص استقبال ہے۔

اے۔ رحمان
چیئرمین: عالمی اردو ٹرسٹ
مینجنگ ڈائرکٹر: عالمی میڈیا پرائیویٹ لیمیٹیڈ

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

جلد:2 شمارہ:3 مارچ 2014

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبۂ ادارت 'بچوں کی دنیا': 49539011

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: فون: 26109746
ای میل: sales@ncpul.in
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	2
نظم	چھ لڑکیاں	مظفر حنفی	3
مضمون	طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو	ثمینہ پروین	4
دل چسپ خبریں	دنیا ایک عجائب خانہ	ادارہ	6
نظم	ہولی ہے بھئی ہولی ہے	نصرت ظہیر	10
مضمون	کیڑوں کی عجیب دنیا	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	11
مضمون	ٹیلی فون سے موبائل تک	ٹی این سریواستو	16
نظم	جنگل میں منگل	محبوب راہی	20
کہانیاں	بدلے کی آگ	عظیم اقبال	21
	دو بھائی	جی انیس احمد	24
	انعام	نکہت پروین	26
	ٹفن باکس	وکیل نجیب	29
	ہم ایک ہیں	شکیل جاوید	31
	کہانی ٹوٹو کی	مہ ناز بانو	34
	بہادری کا سکّہ	جاپانی کہانی پیشکش: محمد حسین	36
ننھے فنکار	بچوں کی تخلیقات	ادارہ	38
اس ماہ کی باتیں	مارچ	ادارہ	40
کامکس	گلیور بالشتیوں کی دنیا میں-3	جوناتھن سوئفٹ	47
آپ کے سوال	ڈاکٹر بقراط کے جواب	ادارہ	53
قسط وار ناول	اسّی دن کا سفر-آخری قسط	جولز ورنے	57

آپس کی باتیں

بچو آپ نے حضرت امیر خسرو دہلوی کا نام یقیناً سنا ہوگا۔ وہی امیر خسرو جنھیں طوطئ ہند بھی کہتے ہیں۔ طوطئ ہند یعنی ہندوستان کی سریلی اور میٹھی آواز۔ دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں امیر خسرو کا شمار ہوتا ہے اور یہ ہم سب کے لیے بے حد فخر کی بات ہے کہ وہ ہمارے ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے جو خود دنیا کے اہم ترین ادیبوں میں شامل ہے برسوں پہلے امیر خسرو کے بارے میں کہا تھا کہ دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب میں ایسا کوئی شاعر نہیں ملتا جس نے اپنے ملک کے حالات اور واقعات کو اتنی تفصیل کے ساتھ شعروں میں بیان کیا ہو جتنی تفصیل سے امیر خسرو نے اپنی طویل مثنویوں میں کیا ہے۔ ان کے شعروں میں جو مٹھاس ہے اس کی تعریف بھی سبھی نے کی ہے۔ مرزا غالب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یہاں تک کہ میر تقی میر کا ذکر بھی آیا تو ان کی تعریف بھی انھوں نے گھما پھرا کر ہی کی۔ لیکن امیر خسرو کی تعریف میں وہ سرِ تسلیم خم کرتے نظر آتے ہیں۔ اس باکمال شاعر کی تعریف میں ان کا یہ شعر کافی مشہور ہے:

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

یعنی یہ کہ میرے کلام میں جو مٹھاس ہے وہ اس لیے ہے کہ میں امیر خسرو جیسے میٹھی بولی بولنے والے شاعر کے پاؤں دھو کر پیتا ہوں۔ یہ ہے امیر خسرو کی عظمت۔ لیکن ہم اردو والوں کے لیے امیر خسرو اس لیے بھی عظیم ہیں کہ اردو شاعری کی ابتدا ان ہی سے ہوتی ہے۔ امیر خسرو نے زیادہ تر شاعری فارسی زبان میں کی تھی لیکن ہندوستان کے عام لوگوں کی زبان میں شعر کہنا بھی انھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ سات سو سال پہلے کے اس زمانے میں یہ زبان ہندوی، یعنی ہندوستانی زبان کہلاتی تھی۔ بعد میں یہی زبان اردو کے نام سے شروع ہوئی۔ حضرت امیر خسرو نے اس زبان میں بھی بہت سی غزلیں، دوہے، گیت، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں کہیں جس سے اردو میں شاعری کا رواج پڑا۔ اسے دیکھتے ہوئے قومی اردو کونسل کی رائے رہی ہے کہ ان کی پیدائش کے دن کو 'یوم اردو' کے طور پر منایا جانا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے حال ہی میں قومی اردو کونسل کی طرف سے یہ تجویز حکومت کے سامنے رکھی کہ ہر سال امیر خسرو کے یوم ولادت 3 مارچ کو یوم اردو منانا چاہیے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ حکومت نے ہماری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ہر سال 3 مارچ کو قومی حیثیت سے 'یوم اردو' کے طور منانے کی اجازت دے دی ہے۔ لہٰذا میری آپ سے اور اردو سے محبت کرنے والے تمام دوستوں سے گزارش ہے کہ 3 مارچ کو 'یوم اردو' منائیں اور اردو کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کا عہد کریں۔ اس شمارے میں ہم حضرت امیر خسرو کے بارے میں ایک معلوماتی مضمون شامل کر رہے ہے جسے پڑھ کر آپ ان کی شخصیت اور کمالات کے بارے میں کافی کچھ جان پائیں گے اور آپ کو یہ اندازہ بھی ہو سکے گا کہ امیر خسرو اور اردو زبان میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

اس مرتبہ 'بچوں کی دنیا' میں مضامین کے علاوہ کہانیوں کا حصہ کچھ بھاری ہے جس کی وجہ سے چند کالموں کو شمارے میں جگہ نہیں مل پائی ہے۔ مگر خیر آئندہ شمارے میں یہ سبھی موجود رہیں گے۔ جولز ورنے کا دل چسپ ناول 'اسّی دن کا سفر' اس شمارے کے ساتھ مکمل ہو رہا ہے چنانچہ آئندہ مہینے سے ہم ایک نیا دل چسپ سلسلہ شروع کریں گے۔

اس مہینے سے آپ کے امتحانات بھی شروع ہو رہے ہیں۔ خوب جی لگا کر محنت کیجیے تا کہ اچھا نتیجہ آئے تو آپ کے ابّو امّی فخر کے ساتھ اپنے ملنے جلنے والوں سے آپ کا ذکر کر سکیں۔ اور ہاں، اس مہینے ہولی بھی تو ہے۔ امتحانوں سے فرصت ملے تو اس تہوار کا بھی لطف اٹھائیے۔ تمام ہندوستانی بچوں کی طرح آپ سبھی کو اس کی خوشیاں مبارک ہوں۔ اب اپنے دوست کو اجازت دیجیے۔ اگلے مہینے پھر ملاقات ہوگی۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

□ مظفر حنفی

چھ بچیاں نرالی

شمرہ مازا پینے والی
میگی کھا کر جینے والی
تتلی کے پَر سینے والی
پورم پور قرینے والی

اقرا آنکھ نچانے والی
سب خبریں پہنچانے والی
مہندی روز رچانے والی
دن بھر دھوم مچانے والی

مدّو نظمیں گڑھنے والی
الماری پر چڑھنے والی
تھوڑا کھا کر پڑھنے والی
چھپ کر ناول پڑھنے والی

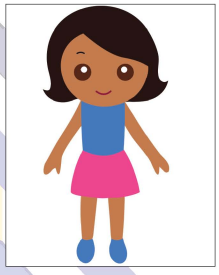

وجّو قصے کہنے والی
وہ پھولوں کے گہنے والی
سب کی باتیں سہنے والی
اپنی دھن میں رہنے والی

حمّو جادو کرنے والی
پیسوں کو چھو کرنے والی
گڑ کو لڈو کرنے والی
ابو ابو کرنے والی

سہا چکن بریانی والی
پریشان پیشانی والی
پھول بتاشے پانی والی
اپنے نانا نانی والی

♦ پروفیسر مظفر حنفی D-40، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی 11002

□ ثمینہ پروین

طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو دہلوی

پیارے بچو، آپ نے امیر خسرو کا نام ضرور سنا ہوگا جنھیں طوطیٔ ہند بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک صوفی بزرگ تھے جو شاعری بھی کرتے تھے، جنگوں میں بھی شریک ہوتے تھے، موسیقی سے بھی انھیں بے حد لگاؤ تھا اور جنھیں اردو کا پہلا شاعر بھی مانا جاتا ہے۔ ابوالحسن یمین الدین خسرو ان کا پورا نام تھا اور امیر خسرو دہلوی کے نام سے وہ اپنی وفات کے سات سو سال بعد آج بھی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ دنیا کے بے مثال شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

حضرت امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین محمد ایک ترک فوجی افسر تھے اور چنگیز خان کے حملے کے بعد اپنے وطن سمرقند کو چھوڑ کر ہندوستان آ گئے تھے۔ یہاں شمالی ہندوستان میں جہاں اس وقت صوبۂ اتر پردیش ہے وہاں موجودہ ایٹہ کے علاقہ پٹیالی میں حضرت امیر خسرو 3 مارچ 1253 کو پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ہندوستانی تھیں۔ اس طرح ہندوستانی رسم و رواج اور رہن سہن کے طور طریقوں کو سمجھنے میں انھیں زیادہ دیر نہیں لگی۔

پٹیالی کا قصہ بھی عجیب ہے۔ ان دنوں دہلی میں سلطان ناصر الدین محمود کی حکومت تھی۔ والد امیر سیف الدین چونکہ ہزارہ کے حکمراں شمس الدین التمش کی فوج کے سربراہ رہ چکے تھے اس لیے دہلی میں التمش اور امیر سیف الدین کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ امیر کو سلطان نے ضلع پٹیالی کی ریاست تحفہ میں سونپ دی جو آج ضلع ایٹہ کہلاتی ہے۔ امیر سیف الدین نے بلبن کے مشہور وزیر جنگ، راوت ارض کی بیٹی بی بی دولت ناز سے شادی کر لی۔ ان کے چار اولادیں ہوئیں تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ امیر خسرو کی پیدائش کے سات سال بعد ان کے والد کا 1260 میں انتقال ہو گیا۔

خسرو بے حد ذہین تھے۔ انھوں نے آٹھ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ والد کی وفات کے بعد وہ دہلی میں اپنے نانا امداد الملک کے گھر آ گئے۔ خسرو 20 سال کے تھے جب نانا کا بھی 113 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد والدہ نے ہی امیر خسرو کی پرورش کی۔ نانا کے انتقال کے بعد خسرو سلطان بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کی فوج میں ملازم ہو گئے۔ تب تک وہ بہت سے شعر کہہ چکے تھے جنھیں دربار شاہی میں کافی داد ملی۔ جب وہ 47 سال کے تھے تو ان کی والدہ اور بھائی کا انتقال ہو گیا جس سے انھیں بہت صدمہ ہوا اور دہلی میں اپنے پیر و مرشد اور ہندوستان کے عظیم صوفی محبوب الٰہی حضرت نظام الدین سے ان کا قلبی اور روحانی لگاؤ ہو گیا۔ ان کی تعریف میں انھوں مثنوی کی شکل میں بہت سے اشعار بھی کہے۔ ان کی زندگی میں ایک کے بعد ایک لوگ دہلی کے سلطان بنتے رہے۔ کل ملا کر انھوں نے سات بادشاہوں کی حکومتیں دیکھیں۔ ان کی شخصیت میں یہ بڑی خوبی تھی کہ سب کو اپنا بنا لیتے۔ اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین کی خانقاہ میں تو وہ بے حد عزیز تھے ہی جو کبھی کسی بادشاہ سے نہیں ملنے گئے۔ دوسری طرف حکمرانوں کے دربار میں بھی انھوں نے بڑی عزت پائی جو ہر وقت عوام کے ساتھ رہنے والے حضرت نظام

امیر خسرو نوجوانوں کے ساتھ: نامعلوم ایرانی مصور کی بنائی ہوئی ایک قدیم پینٹنگ

الدین کی عوامی مقبولیت سے اکثر خوف زدہ رہا کرتے تھے۔

دہلی میں سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں حضرت نظام الدین کی وفات ہوئی جس کا امیر خسرو کو اتنا صدمہ پہنچا کہ 1325 میں محبوب الٰہی کی وفات کے چند مہینے بعد وہ بھی دنیا سے چلے گئے۔ ان کی وفات پر خسرو نے کہا تھا:

گوری لیٹی سیج پر مکھ پے ڈالے کیش
چل خسرو گھر آپنے سانجھ ہوئی چہوں دیش

حضرت امیر خسرو کا مزار ان کی خواہش کے مطابق خواجہ نظام الدین کے مزار کے قدموں میں بنایا گیا، جہاں آج بھی دنیا بھر سے ہزاروں ان کے چاہنے والے ہندوستانی تہذیب میں رچے بسے امیر خسرو کو ان کے عرس کے موقع پر خراج عقیت پیش کرنے آتے ہیں۔

امیر خسرو دہلوی کا فارسی شعری ادب میں بڑا اونچا مقام ہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے پانچ لاکھ سے زیادہ شعر کہے جو ہندوستان افغانستان، ایران، قزاخستان، ازبیکستان اور سینٹرل ایشیا کے مختلف خطوں میں لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کے شعر ان کی زندگی میں ہی دور دور تک مشہور ہو گئے تھے۔

خسرو کو راگ راگنیوں اور ہندوستانی موسیقی سے بھی بڑا شغف تھا۔ کہتے ہیں کہ ہندوستانی ساز، ستار میں دو تار ہوا کرتے تھے۔ امیر خسرو نے اس میں تیسرے تار کا اضافہ کر کے اس ساز کو ایک نئی آواز دے دی جو آج بھی سننے والوں کے دلوں کو جھنجھنا دیتی ہے۔

لیکن امیر خسرو کا سب سے بڑا کارنامہ اردو زبان ہے جس کی داغ بیل ان کی عوامی زبان کی شاعری نے ہی ڈالی تھی۔ وہ فارسی، ترکی، عربی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے بھی عالم تھے اور ہندوستان کی مختلف زبانیں جانتے تھے۔ ان میں وہ زبان انھیں بے حد عزیز تھی جسے ہندوی کہتے تھے اور جو بعد میں اردو زبان کہلائی۔ فارسی کے بعد ان کے سب سے زیادہ شعر اسی زبان میں ملتے ہیں۔ ان میں فارسی اور عربی کی ملاوٹ سے کہی گئی غزلوں کے علاوہ دیسی اردو میں کہی گئی پہیلیاں، راگ راگنیاں، کہہ مکرنیاں اور مختلف موقعوں کے لیے کہے گئے گیت شامل ہیں۔ کچھ کلام ان کا پنجابی زبان میں بھی ہے۔

کل ملا کر امیر خسرو ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے سب سے پہلے عظیم شاعر اور روشن دماغ فلسفی تھے اور عام لوگوں کے ذہن سے ان کی قربت اتنی تھی کہ آج بھی ان کی اردو تخلیقات شہروں قصبوں اور دیہات میں گائی جاتی ہیں۔ □

♦ ثمینہ پروین، ریاض، سعودی عرب

امیر خسرو کی پہیلیاں

دیا یعنی چراغ

بالا تھا جب سب کو بھایا　　بڑا ہو اکچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں　　بوجھے نہیں تو چھوڑے گاؤں

قینچی

اندر چلمن باہر چلمن بیچ کلیجہ دھڑکے
امیر خسرو یوں کہیں وہ دو دو انگل کرکے

کاجل

جل کر بنے جل میں رہے　　آنکھوں دیکھا خسرو کہے

آئینہ

فارسی بولی آئی نا　　ترکی ڈھونڈی پائی نا
ہندی بولوں آرسی آئے　　خسرو کہے کوئی نہ بتائے

ادارہ

دنیا ایک عجائب خانہ

دس لاکھ مکڑیاں: انگلینڈ کے کاریگروں کا تیار کیا ہوا یہ خوب صورت سنہرا گاؤن ریشمی یا سوتی دھاگوں سے نہیں بلکہ ایک ایسے جاندار کی مدد سے بنایا گیا ہے جس کا نام سنتے ہی اکثر لوگوں کو کراہت ہوتی ہے۔ یہ جاندار ہے مکڑی، جس کے بُنے ہوئے جالوں سے یہ لباس ہاتھ سے چلائی جانے والی کھڈّی پر تیار کیا گیا ہے۔ مگر یہ کسی عام مکڑی نہیں بلکہ مڈگاسکر جزیروں میں پائی جانے والی ایک خاص مکڑی کے جالوں سے بُنا گیا ہے۔ مگر اس گاؤن کے لیے دس لاکھ سے زیادہ مکڑیوں کے جال استعمال میں لائے گئے ہیں۔

سیب کی بطخ: انگلینڈ کے باورچی بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ایک شیف Chef نے سیب کو بطخ کی شکل دی ہے۔ تیز چھری سے سیب کاٹ کر بنائی گئی یہ بطخ تیرتی تو نہیں لیکن آپ کی ڈائننگ ٹیبل کی زینت ضرور بڑھا سکتی ہے۔

الٹی پینٹنگ: چین کی یہ طالبہ کینوس پر الٹی تصویر بناتی ہے اور جب کینوس کو سیدھا رکھتی ہے تبھی پتہ چلتا ہے کہ اس نے کیا بنایا ہے۔

بلبلے کا کمرہ: فرانس کے لوگ بڑے زندہ دل مانے جاتے ہیں۔ وہاں ایک ہوٹل Attrap' Reves ہے جو سرسبز وادی میں بنایا گیا ہے۔ چاروں طرف پھیلے حسین قدرتی مناظر کا لطف وہاں رہنے والے ہر وقت لے سکیں یہ سوچ کر ہوٹل میں شیشے کے بلبلوں جیسے کمرے بنائے گئے ہیں۔ ہر کمرہ دو لوگوں کے لیے ہوتا ہے اور اس میں ایک رات اور دن رہنے کا کرایہ ہے صرف 100 پونڈ۔ یہی کوئی سات آٹھ ہزار روپے!

شیشے کا محل: اٹلی کا ایک خوب صورت شہر ہے وینس Venice۔ نہروں اور پلوں سے جڑا ہوا 118 چھوٹے چھوٹے جزیروں والا عجیب و غریب شہر۔ وہاں کے شیشے کے کاریگر پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ وہیں کے ایک استاد کاریگر کارلو نے شیشے کو تراش کر ایک ایسا دو منزلہ محل بنایا ہے جس کے زینے، فرش، چھت، بستر، میز، کھڑکیاں، دروازے، کچن، چولھا، پتیلیاں، الماریاں وغیرہ سب شیشے کے بنے ہوئے ہیں۔ اسے کارلو نے سات ملی میٹر موٹے شیشے سے بنے ہیں اور یہ خاصا مضبوط بھی ہے!

بیلنس کی مہارت: عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ ہر چھوٹی چیز کے اوپر رکھی ہوئی بڑی چیز نیچے گر جاتی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب اوپر نیچے کی دونوں چیزیں ٹیڑھی میڑھی اور نوکیلی ہوں۔ لیکن جنوبی کوریا کے ایک فنکار ہیں مسٹر را کی ہیون۔ وہ چھوٹے پتھروں کے اوپر بہت بڑے اور وزنی پتھروں کو بیلنس کر کے رکھ دینے کے ماہر ہیں۔ تصویر میں آپ دیکھیں گے کہ کیسے انھوں نے ایک چھوٹے پتھر کی نوک پر ایک الٹے پہاڑ جیسے بڑے پتھر کو اس طرح بیلنس کر کے رکھ دیا ہے کہ وہ نیچے نہیں گرتا۔ یہ تماشہ انھوں نے دبئی میں دکھایا اور سب کو حیران کر دیا۔ وہ اسکوٹی، واشنگ مشین، اور بائیسکل کو بھی آڑے انداز میں ان پتھروں پر ٹکا کر رکھ دیتے ہیں۔

پانی سے پرہیز: جی نہیں۔ یہ صاحب آگ کے کسی حادثے میں جھلس کر ایسے نہیں ہوئے نہیں۔ یہ ایرانی صوبہ فارس کے 80 سالہ آموحاجی ہیں جو پچھلے 60 سال سے نہائے نہیں ہیں، اور اتنی زیادہ بدبو دیتے ہیں کہ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ انھیں وہم ہے کہ اگر وہ

نہائے تو بیمار ہو کر مر جائیں گے۔ کہتے ہیں یہ اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ اس سے پہلے ہندوستان کے ایک صاحب 66 سالہ کیلاش سنگھ سب سے زیادہ عرصے تک نہ نہانے کے ریکارڈ کے مالک تھے۔ ایک پجاری کے کہنے پر انھوں نے 38 برس تک غسل نہیں کیا۔

مکھیوں کا انسانی چھتّہ: اوفوہ! خدا کی پناہ۔ دیکھیے تو سہی چین کے روآن لیانگ منگ صاحب نے کس طرح شہد کی مکھیوں سے خود کو ڈھک لیا ہے۔ تقریباً 62 کلوگرام مکھیوں سے خود کو ڈھک کر انھوں نے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام درج کرایا ہے۔ واقعی صاحب، عجیب لوگوں سے بھری پڑی ہے یہ دنیا۔

تصویر ساز چڑیاں: کہیے، کیسی لگی پینٹنگ؟ جانتے ہیں اس کا مصور کون ہے؟ یہ تصویر بنائی ہے آئرلینڈ کے شہر ڈبلن کے آسمان میں اڑنے والی ہزاروں ننھی منی چڑیوں نے جو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں جھنڈ بنا کر اڑ رہی ہیں۔ لیکن کمال صرف ان پرندوں کا ہی نہیں، اس فوٹو گرافر کا بھی ہے جو قدرت کے اس حسین تماشے کو دیکھنے کے لیے بروقت وہاں موجود تھا۔ ورنہ یہ منظر تصویر میں کیسے ڈھلتا!

بل گیٹس کو مات: حال ہی میں دنیا کے دوسرے سب سے زیادہ دولت مند شخص، مائکروسوفٹ کمپنی کے مالک بل گیٹس نے ایک ٹی وی شو میں شطرنج کے کھلاڑی ناروے کے میگنس کارلسن کے ساتھ شطرنج کھیلی۔ بے شمار دولت سے کھیلنے والے اس شخص کو میگنس نے چند ہی چالوں میں مات دے دی! سچ ہے، دولت سے سب کچھ نہیں ملتا۔

حسین زینے: ذہن اگر فنکارانہ ہو تو مہارت دکھانے کے لیے کوئی بھی ذریعہ چن لیتا ہے۔ لبنان کے آرٹسٹک مزاج رکھنے والے جوان پینٹروں کی ٹیم نے اپنا فن دکھانے کے لیے سیڑھیوں کو منتخب کر لیا اور انھیں اس طرح رنگ ڈالا ہے کہ جو دیکھتا ہے دیکھتا رہ جاتا ہے۔

انجینئرنگ کا کمال: بیلا روس کے شہر منسک میں کھڑا یہ دنیا کا سب سے بڑا ڈمپر ہے۔ لمبائی 65 فٹ اونچائی 26 فٹ 450 ٹن کچرا ڈھونے کی صلاحیت 25 میل فی گھنٹے کی رفتار 16 ہزار فٹ کی بلندی پر منفی 50 ڈگری کی ٹھنڈ میں بھی کام کرنے والا! ہے نہ انجینئرنگ کا کمال!

کامکس کرداروں سے محبت: مغرب میں لوگ کامکس کرداروں سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ برطانیہ کے نیتھن اور ایمنڈا نے روایتی انداز میں دولہا دلہن بننے کی بجائے کامکس کرداروں شریک Shrek اور شہزادی فیونا Fiona بن کر شادی کی۔ تقریب کے مہمان بھی اپنی پسند کے کامکس کرداروں کا بھیس بدل کر آئے۔ مگر یہ صرف تفریحاً نہیں کیا گیا، تقریب سے ہونے والی آمدنی کینسر کی ریسرچ کے لیے دے دی گئی۔

زردی الگ کرنے کا اوزار: انڈے کی زردی کو سفیدی سے الگ کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ امریکہ میں مچھلی جیسا ایک اوزار بنالیا گیا ہے جسے بس زردی سے چھو دیجیے وہ سفیدی سے الگ ہو جائے گی۔

دل چسپ سہولت: برطانیہ کی ایک کمپنی نے اپنے ملازمین کو بار بار سیڑھیوں سے اترنے کی محنت سے نجات دلانے اور وقت بچانے کے لیے دفتر کے اندر ایک 20 فٹ لمبی سرنگ نما سلائیڈ لگوا دی ہے۔ فائل لانی یا پہونچانی ہو تو عملے کے لوگ اس سلائیڈ کے ذریعے ایک منزل سے نچلی منزل تک صرف تین سیکنڈ میں آجاتے ہیں۔ یہ ایک سہولت تو ہے ہی ساتھ میں تفریح بھی ہو جاتی ہے۔ □

نظم

نصرت ظہیر

ہولی ہے بھئی ہولی ہے!

گلی گلی رنگولی ہے
ہر سو ہنسی ٹھٹھولی ہے
بچوں کی اک ٹولی ہے
سب کی ایک ہی بولی ہے
شور مچاتی ڈولی ہے
ہولی ہے بھئی ہولی ہے

اِس نے اُس کو رنگ لگایا
خوب عبیر گلال اڑایا
پچکاری سے کوئی نہایا

رام رحیم ہو یا سکھوندر
جان اسمتھ ہو یا آئینگر
ترویدی تیاگی یا انور

دوڑیں ناچیں گائیں جھومیں
گلیوں گلیوں گھر گھر گھومیں
میٹھے اور نمکین کی دھومیں بچوں کی اک ٹو لی ہے
شور مچاتی ڈولی ہے
ہولی ہے بھئی ہولی ہے

□ شمس الاسلام فاوقی

کیڑوں کی عجیب دنیا

ارے بھئی یہ کیڑے کا لفظ سن کر آپ کا منہ کیوں بن گیا۔ لگتا ہے کیڑے آپ کو بہت برے لگتے ہیں اور شاید آپ انھیں گندہ اور حقیر خیال کرتے ہیں۔ آپ کی بات کسی حد تک ضرور صحیح ہو سکتی ہے مگر پوری طرح نہیں۔ یہ سچ ہے کہ کیڑے گندے بھی ہوتے ہیں جیسے مکھی، تل چٹا اور جھینگر وغیرہ مگر بعض کیڑے پھول جیسے رنگین اور خوبصورت بھی ہوتے ہیں جیسے رنگ برنگی تتلیاں، پروانے اور ہیلی کاپٹر کی طرح اڑنے والی پیاری پیاری بھمبیریاں۔ جہاں ایک طرف مچھر جیسے موذی کیڑے ملیریا اور ڈینگو کے بخار پھیلاتے ہیں وہیں کچھ کیڑے ایسے بھی ہیں جو انسانوں کے لیے فائدہ مند ہیں جیسے شہد کی مکھیاں جو ہمیں شہد دیتی ہیں اور ریشم کا کیڑا جس سے ہمیں ملائم ریشم کا دھاگا ملتا ہے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے کیڑے کے لفظ سے منہ بنانا اور گھن کھانا ٹھیک نہیں ہے بلکہ آپ کو تو ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرنا چاہیے۔ کیڑوں کی بھرپور معلومات ہی ان کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔

کیڑوں کے بارے میں جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اوّل تو ان کی تعداد دنیا کے دوسرے جانداروں کے مقابلے سب سے زیادہ ہے اور دوسرے یہ کہ وہ انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ وہ یا تو انسانوں کے دوست ہیں یا پھر دشمن۔ حیوانات کی دنیا پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں 75 سے 80 فی صدی تو بس کیڑے ہی کیڑے ہیں۔ آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ کیڑوں کی جانی مانی قسموں کی تعداد 1.5 ملین یعنی پندرہ لاکھ سے زیادہ ہے۔ پھر ہر قسم میں اتنے زیادہ کیڑے ہوتے ہیں کہ انھیں شمار کرنا تک ممکن نہیں۔ بعض کیڑوں سے تو آپ بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ ذرا سوچیے چیونٹیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ ساری دنیا ان سے بھری پڑی ہیں۔ اسی طرح گھریلو مکھیاں اور مچھر بھی ہیں جو تعداد میں اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے۔ لگتا ہے یہ جتنے مارے جاتے ہیں اتنا ہی ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم آگے چل کر آپ کو بتائیں گے۔

پہلے تو آپ یہ جان لیجیے کہ کیڑے دراصل ہیں کیا۔ کیڑوں کو ہندی زبان میں کیٹ انگریزی میں انسیکٹس Insects اور اردو میں کیڑے یا حشرات کہتے ہیں۔ ان کے جسم میں تین حصے ہوتے ہیں، سر، سینہ اور پیٹ۔ سر پر دو بڑی بڑی آنکھیں اور ایک جوڑی بال جیسے

ریشے۔ کیڑوں کی ہر آنکھ میں بہت سے لینس ہوتے ہیں۔ مکھیوں اور بھمبھیریوں وغیرہ میں تو یہ تعداد پچاس ہزار تک ہوجاتی ہے جن کی وجہ سے ان آنکھوں کو مرکب آنکھیں کہتے ہیں۔ بال جیسے ریشے انٹینا Antennae کہلاتے ہیں جن کے ذریعے کیڑے اپنے آس پاس کی چیزوں سے خود کو باخبر رکھتے ہیں۔ انٹینا کی مدد سے انھیں پتا چل جاتا ہے کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں اور ان کے آس پاس کیا ہے۔ وہ کہیں کسی شکاری جاندار کے نشانے پر تو نہیں ہیں۔ سر کے فوراً پیچھے سینہ ہوتا ہے جس کے اوپری حصے پر عام طور سے دو جوڑی پَر ہوتے ہیں۔ پہلی جوڑی کے بڑے اور دوسری کے ذرا چھوٹے۔ کچھ کیڑوں جیسے مکھیوں میں صرف ایک ہی جوڑی پَر ہوتے ہیں اور کچھ میں ہوتے ہی نہیں، مگر ایسے کیڑوں کی قسمیں بہت کم ہیں۔ چیونٹیوں اور دیمک کے پَر نہیں ہوتے مگر زندگی کے ایک حصے میں وہ بھی پَر دار ہوجاتے ہیں تاکہ زمین میں دور دور تک پھیل کر اپنی نسلیں بڑھا سکیں۔ سینے کے نچلے حصے پر تین جوڑی پیر ہوتے ہیں اور ہر پَر کئی کئی حصوں سے مل کر بنتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ کیڑے کسی بھی جگہ آسانی سے بیٹھ سکتے ہیں اور حرکت کرسکتے ہیں۔ سینے کے بعد ایک لمبوترا پیٹ ہوتا ہے جو کئی حصوں سے مل کر بنتا ہے۔ پیٹ پر کوئی دوسرے اعضا نہیں ہوتے البتہ آخری حصے پر ڈنک جیسا عضو ہوتا ہے جو مادہ کیڑوں میں انڈے دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

کچھ لوگ بعض دوسرے جانداروں کو بھی کیڑا سمجھ بیٹھتے ہیں جو درست نہیں ہے۔ کیچوا، بچھو، کن کھجورا، مکڑی اور بیربہوٹی جیسے جانداروں کا تعلق حیوانات کے مختلف گروہوں سے ہے جو کیڑوں کے گروہ سے الگ ہیں۔ کیچوے کا جسم ایک جیسا لمبا ہوتا ہے اور وہ اپنے جسم کو سکیڑ اور پھیلا کر آگے بڑھتا ہے۔ کن کھجورے کے جسم میں بہت سے قطعے ہوتے

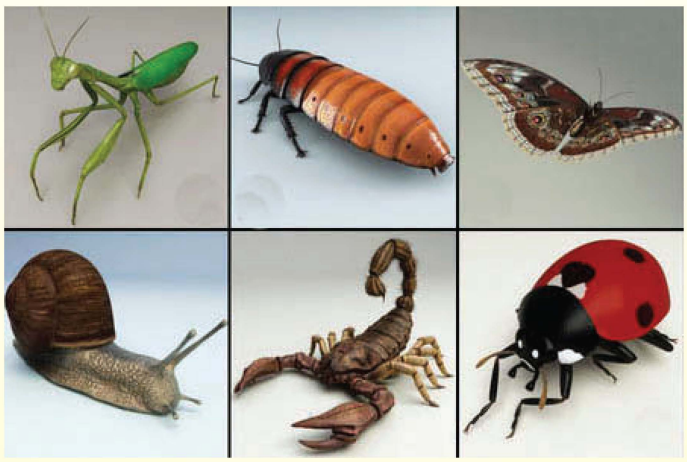

ہیں اور ہر قطعے پر دائیں بائیں ایک ایک جوڑی پیر ہوتے ہیں۔ بچھو، مکڑی اور پیر بہوٹی کے جسم میں صرف دو ہی حصے ہوتے ہیں اور پیروں کی تعداد بھی تین جوڑی کے بجائے چار جوڑی ہوتی ہے۔ انسانوں کے پیٹ میں کئی طرح کے جاندار پیدا ہوجاتے ہیں جنہیں لوگ کیڑوں کا نام دیتے ہیں جو درست نہیں ہے۔ انھیں کرم کہنا ٹھیک ہے جن کا تعلق حیوانات کے مختلف گروہ سے ہے۔ اسی طرح وائرس اور بیکٹر یا بھی کیڑے کہلاتے ہیں جو غلط ہے۔ انھیں جراثیم کہنا چاہیئے۔

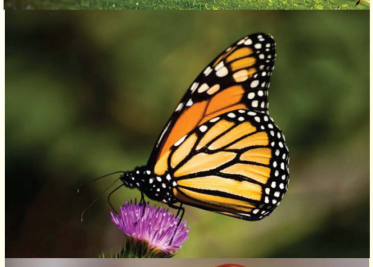

کیڑوں کے جسم عام طور سے چھوٹے اور ملائم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں کیڑے انتہائی سخت جان مخلوق ہیں۔ ماہرین کا انداز ہے کہ کیڑے اس زمین پر اب سے کوئی 25 تا 50 کروڑ سال پہلے آئے تھے اور تب سے آج تک خوب اچھی طرح پھل پھول رہے ہیں۔ اس دوران کتنے ہی قسم کے جاندار پیدا ہوئے اور ختم ہوگئے۔ ڈائینا سورس ان میں سے ایک ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب اس زمین پر ان ہی کا راج تھا مگر زمانے کے اتار چڑھاؤ، آپسی لڑائیوں اور غذا کی کمی نے انھیں ایسا ختم کیا کہ آج ان کا نشان بھی نہیں ملتا۔ وہ صرف اپنی ہڈیوں اور جسم کے باقیات یعنی فاسلس سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔

کاکروچ جیسے ہم تل چٹا بھی کہتے ہیں تقریباً ہر گھر کے باورچی خانے میں پایا جاتا ہے۔ آپ اس کیڑے کو طرح طرح کی دوائیں چھڑک کر ختم کیجئے مگر پھر بھی اس کی تعداد میں کمی نہیں آتی۔ تل چٹا اب سے کوئی 30 کروڑ سال پہلے وجود میں آیا تھا۔ اس کے فاسل اور آج کے تل چٹے میں بس برائے نام ہی فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ اس کی ساخت اس قدر عمدہ تھی کہ وہ زمانے کی ہر اونچ نیچ کو آسانی سے جھیل گئی۔ ماہرین کہتے ہیں کہ اگر نیوکلیائی جنگ ہوئی تو سب ہی جاندار ختم ہوجائیں گے لیکن اگر کوئی بچے گا تو وہ تل چٹا ہوگا۔

کیڑوں کے اتنے لمبے عرصے تک پھولنے پھلنے کے کئی راز ہیں۔ ان کا جسم چونکہ عام طور پر بہت چھوٹا ہوتا ہے اس لیے ہر بڑے وقت میں کسی چھوٹی جگہ جیسے سوراخ یا دراڑ وغیرہ میں خود کو چھپا کر وہ

اپنی حفاظت کر لیتا ہے۔

کیڑے انڈے یا بچے بہت زیادہ دیتے ہیں اور انھیں بالغ ہونے میں بھی بہت کم وقت لگتا ہے۔ آپ عام گھریلو مکھی کی مثال لیجئے۔ اس کی مادہ ہر روز 75 سے 150 انڈے دیتی ہے جن سے دس روز بعد ہی پوری مکھی بن جاتی ہے۔ اگر ایک مادہ مکھی اوسطاً 120 انڈے دے اور ان سے صرف آدھی یعنی 60 مادہ مکھیاں پیدا ہوں تو تیسری پیڑھی تک تین ہزار چھ سو مادہ مکھیاں دوبارہ 120 انڈے دینے کے لیے تیار ہو جائیں گی۔ اگلے دس روز میں صرف مادہ مکھیوں کی تعداد دو لاکھ سولہ ہزار اور بیس روز بعد ایک کروڑ انیس لاکھ ہو جائے گی۔ اندازہ ہے کہ اپریل سے ستمبر تک ایک مکھی کی اولاد اتنی زیادہ ہوگی جو ممبئی شہر کو ڈھانپنے کے لیے کافی ہوگی۔ اب سوچیے جو جاندار اس تیز رفتاری سے بڑھتے ہوں کیا انھیں ختم کر دینا ممکن ہے؟

کیڑوں کا جسم ایک سخت کھال سے ڈھکا ہوتا ہے جو اُن کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ ہمارے اور دوسرے بڑے جانوروں کے جسم میں جس طرح ہڈیاں ہوتی ہیں، کیڑوں کے جسم میں ان کی کھال ہوتی ہے۔ یہ کھال کیڑوں کے نرم اعضا کی حفاظت کرتی ہے۔ عضلات یا پٹھے بھی اسی کھال سے جڑے ہوتے ہیں، کیونکہ کیڑوں کے جسم اور پیر وغیرہ ٹکڑوں کے بنے ہوتے ہیں اس لیے عضلات کا کھچاؤ کیڑوں کے جسم میں کسی بھی سمت میں حرکت کرنے میں مدد دیتا ہے۔ سخت کھال جسم کی نمی کو آسانی سے ضائع نہیں ہونے دیتی۔ جس کی وجہ سے کیڑے بغیر پانی کے بھی بہت دن تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ منہ کے اعضا بھی یہی سخت کھال بناتی ہے جن کی مدد سے کیڑے ٹھوس غذا کو چبا سکتے ہیں یا پودوں کا عرق اور دوسرے جانداروں کا خون چوس سکتے ہیں۔ سخت کھال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کیڑے مرنے کے بعد بھی زندہ جیسے دکھائی دیتے ہیں اور برسوں اسی حال میں رہتے ہیں۔ کیڑوں کے کسی میوزیم میں جا کر دیکھئے۔ آپ وہاں کئی سو برس پرانے کیڑے بھی اصل حالت میں رکھے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے یا دوسرے بڑے جانوروں کے

جسم میں مرنے کے بعد عضلات گل سڑ کر ختم ہوجاتے ہیں اور ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے، کیڑوں کے جسم میں بھی اندرونی عضلات تو ختم ہوجاتے ہیں مگر ہڈیوں جیسی باہر کی کھال باقی رہ جاتی ہے۔

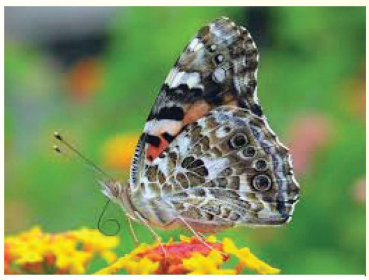

عام طور پر دوسرے جاندار یا تو انڈے دیتے ہیں یا بچے، مگر کیڑے انڈے اور بچے دونوں ہی دیتے ہیں۔ جو انڈے دیتے ہیں ان سے لاروے نکلتے ہیں جو بڑے ہوکر پیوپے بن جاتے ہیں اور پھر ان پیوپوں سے ماں باپ کی شکل کے بالغ کیڑے نکل آتے ہیں، لیکن جو کیڑے بچے دیتے ہیں وہ چھوٹے مگر ماں باپ کی شکل کے ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ وہ بڑے ہوکر بالغ کیڑے بن جاتے ہیں۔

کیڑوں کو اپنے دشمنوں سے بچاؤ کے طریقے بھی آتے ہیں۔ اکثر کیڑے پتوں یا پھولوں کے رنگ کے ہوتے ہیں اور انھیں کے درمیان رہتے ہیں جہاں ان کے دشمن انھیں ڈھونڈ نہیں پاتے۔ کچھ کیڑے لکڑی یا پتے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کا بچاؤ ہوجاتا ہے۔ بعض تتلیوں کے پَروں کی اندرونی سطح رنگین لیکن بیرونی سوکھے ہوئے پتوں جیسی ہوتی ہے۔ وہ اپنے پَروں کو جوڑ کر سوکھے پتوں میں یوں بیٹھتی ہیں کہ ان کے دشمن انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ کچھ کیڑے اپنی ساخت پودوں کے کانٹوں یا درختوں کی چھال جیسی بنالیتے ہیں اور ان کے درمیان بیٹھ کر اپنا بچاؤ کرتے ہیں۔

کیڑے بہت تیزی سے حرکت کرتے ہیں جس کے لیے وہ یا تو اپنے پیروں یا پَروں کا استعمال کرتے ہیں۔ چھ پیروں میں سے تین آگے بڑھائے جاتے ہیں جن میں دو ایک طرف کے اور ایک دوسرے طرف کا ہوتا ہے جبکہ باقی تین پیر ایک تین پائے والے اسٹول کی طرح جسم کا توازن قائم رکھتے ہیں۔ کیڑوں کے پَر ہوائی جہاز کے اصولوں پر کام کرتے ہیں۔ ان کی تیز حرکت ان کے جسم کے اوپر نیچے یا دائیں بائیں ہوا کا دباؤ بڑھاتی ہے جس کے اثر سے کیڑے مخالف سمت میں بہ آسانی حرکت کرتے ہیں۔ مچھروں کے پَر ایک سیکنڈ میں 275 بار اوپر نیچے حرکت کرتے ہیں۔ تیز رفتار سے ان میں آواز پیدا ہوتی ہے اور یہی مچھر کی آواز کہلاتی ہے۔ کیا سمجھے؟ مچھروں کی آواز ان کے منھ سے نہیں پَروں سے آتی ہے! □

♦ ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی 1/B-90، نور نگر، نئی دہلی 110025

□ ٹی این سریواستو

ٹیلی فون سے موبائل تک

مٹھی میں بند موبائل وہ جادو کی ڈبیا ہے جو دم کے دم میں کہاں سے کہاں بات کرادے، گانے سنادے اور جانے کیا کیا سہولتیں فراہم کردے۔ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا اس کے پیچھے ایک ایسے سائنسی ایجاد کی کہانی ہے جس کو موبائل کے مورث یعنی ٹیلی فون کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ آج ہم اسی ٹیلی فون کی کہانی سنانے جارہے ہیں جو اس بھاگتی ہوئی دنیا کو آواز دینے میں اہم مقام رکھتا ہے اور جس نے گویا ہماری بولنے اور سننے کی طاقت کو دور دور تک پھیلا دیا ہے۔

کہانی کے نام پر ہم کو بھی اپنا بچپن یاد آ گیا جب ہم ایک پتلی رسی اور دو دیا سلائی کی ڈبیوں کی مدد سے ٹیلی فون پر بات کرنے کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ دیا سلائی کی دو ڈبیوں کے بھیتری حصے میں سوراخ کرکے رسی کے ایک ایک سرے کو جوڑ دیتے تھے۔ دو لڑکے رسی کی لمبائی کے برابر فاصلہ پر ایک ایک ڈبیا کو ہاتھ میں لے کر، پھس پھساہٹ کی آواز میں ہلو..... ہلو! بات کرنے لگتے تھے۔ یہ تھا ہمارا ٹیلی فون کا کھلونا جو اب پلاسٹک اور نائیلون کی مہربانی سے ہر چھوٹی بڑی کھلونے کی دوکان کے شوکیس میں، رنگ برنگی شکلوں میں اپنا جلوہ دکھلا رہا ہے۔

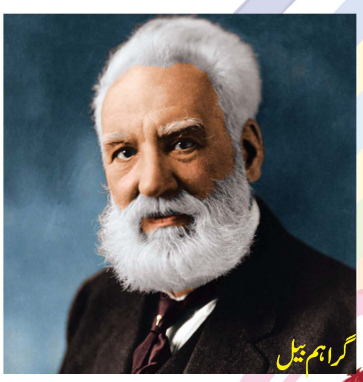
گراہم بیل

قدیم ملک یونان کی مشہور ریاست مقدونیا کے شہرہ آفاق شہنشاہ الیگزینڈر یعنی سکندر اعظم کا نام بھلا کس نے نہ سنا ہوگا جس نے پوری دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پوری دنیا تو نہیں لیکن جہاں تک اس کی تلوار پہنچی وہاں تک تو اس نے فتح حاصل کر ہی لی۔ مگر ہندوستان کی ناکام فتح اس پر بہت بھاری پڑی اور واپس یونان پہنچنے سے پہلے ہی وہ راستے میں ہی ہندوستان کی تلوار کے زخم سہلاتے ہوئے دنیا سے سدھار گیا۔

اس سے پہلے کہ یہ کہانی الف لیلیٰ کی طرح کھینچتی ہوئی کہیں دور نہ

ایک اداکار گراہم بیل کی طرح پہلی بار فون کو استعمال کرتے ہوئے

نکل جائے ہم ایک لمبی چھلانگ لگا کر سیدھے انیسویں صدی میں کود پڑتے ہیں جہاں ہماری ملاقات ایک ایسے الیگزینڈر سے ہوتی ہے جس نے جنگ کا بگل بجا کر نہیں بلکہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجا کر بات چیت کی دوڑ سے ساری دنیا کو باندھ دیا۔ واقعی اس نے تلوار کی دھار سے نہیں، آواز کی رفتار سے دنیا فتح کر لی۔ اس عظیم سائنسداں کا نام تھا الیگزینڈر گراہم بیل Alexender Graham Bell جس نے 1876 میں ٹیلی فون کی ایجاد کی۔ پچھلی صدی کے 10 مارچ 1976

کو اس کا صد سالہ پوری دنیا میں دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔

لفظ ٹیلی فون یونانی زبان یعنی گریک کے دو الفاظ 'ٹیلی' بمعنی 'دور' اور 'فون' بمعنی 'آواز' کا مرکب ہے۔ ٹیلی فون یعنی دور کی آواز کو آمنے سامنے کی بات چیت میں بدل دینے والا یہ کرشمہ ہوا مقناطیس یعنی میگنیٹ اور بجلی یعنی الیکٹریسٹی کی ملی جلی طاقت سے جس نے الہ دین کے چراغ کی طرح وہ جن پیدا کر دیا جو آناً فاناً میں آپ کی آواز کو دہلی، ممبئی ہی نہیں روس، امریکہ تک پہنچا دیتا ہے۔ ٹیلی فون کا یہ جن اب آپ کی مٹھی میں بند ہے۔ چراغ گھسنے کی ضرورت نہیں۔ مٹھی کھول کر بٹن دباتے ہی آقا کا غلام حاضر۔

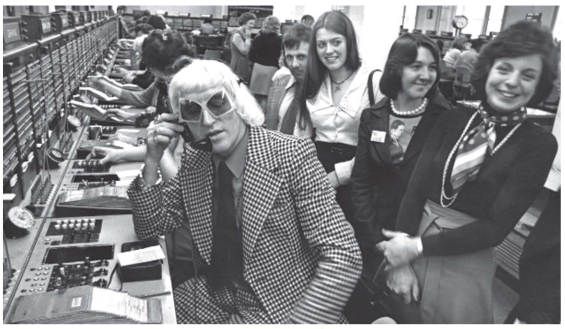

پرانے ٹیلیفون ایکسچینج ایسے ہوا کرتے تھے

ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے یہ سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے بولنے اور سننے کے عمل کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ہم بولتے ہیں تو وہاں پر موجود ہوا میں ایک لہر سی پیدا ہوتی ہے جیسے کہ پانی میں لہریں ہوتی ہیں۔ ہوا میں پیدا ہونے والی لہر سامنے یا آس پاس بیٹھے لوگوں کے کانوں کے اندر کے پردے میں ہلکی سی جنبش پیدا کرتی ہے اور بولی ہوئی بات سن لی جاتی ہے۔ یہی ہے 'کہنے اور سننے' کے بیچ کا راستہ۔ لیکن آواز کی لہریں آگے بڑھتے ہوئے دھیرے دھیرے کمزور پڑ جاتی ہیں اور کان کے پردے میں جنبش پیدا کرنے کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ ہماری آواز کی لہریں کس طرح بجلی کے گھوڑے پر سوار ہو کر دریا، پہاڑ پار کرتے ہوئے چاہے جہاں پہنچ جاتی ہیں۔ اس کی مزیدار کہانی سائنس کی زبان میں سنیے۔

ٹیلی فون انسٹرومنٹ یعنی ٹیلی فون کی مشین میں دو حصے ہوتے

ہیں۔ ایک تو ٹیلی فون کا چونگا یعنی 'ہینڈ سیٹ' اور دوسرا ٹیلی فون کا ڈبا یعنی 'باڈی'۔ ہینڈ سیٹ میں ایک طرف بولنے کے لیے ٹرانسمیٹر اور سننے کے لیے رسیور لگا ہوتا ہے اور باڈی میں گھنٹی، ڈائل اور دوسرے گل پُرزے ہوتے ہیں۔ جب کوئی آدمی ٹیلی فون میں بولتا ہے تو ہوا میں پیدا ہوئی آواز کی لہریں ٹرانسمیٹر کے اندر کھلے ہوئے کاربن گرینولس (کاربن کے بہت چھوٹے چھوٹے یعنی سرسوں کی طرح کے ٹکڑوں) میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں اور آواز کی لہریں بجلی کی لہروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بجلی کی یہ لہریں، دو مقاموں کو جوڑنے والے لوہے، تانبے یا المونیم کے تاروں کے جوڑے پر سوار ہو کر منزل مقصود تک آناً فاناً میں پہنچ جاتی ہیں اور جس کو ٹیلی فون کیا گیا ہے اس کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں یعنی اس کے ٹیلی فون کی باڈی میں لگی گھنٹی بجاتی ہیں۔ اس ٹیلی فون کا رسیور اٹھاتے ہی گھنٹی بجنا بند ہو جاتی ہے اور بجلی کی لہریں پھر سے آواز کی لہروں میں بدل جاتی ہیں اور کان کے پردے کی جنبش سننے کا کام شروع کر دیتی ہے۔ بجلی کی لہروں کو آواز کی لہروں میں بدلنے کی یہ کرامت رسیور کرتا ہے۔

اور پھر تو بچو! تمہارے ابا ہوں یا امی، پاپا ہوں یا ممی اور بھائی جان ہوں یا آپا جان، یہاں وہاں خواہ جہاں ہوں، تم سے اپنی اسی پیاری آواز میں گفتگو کریں گے جیسے وہ تمہارے سامنے موجود ہوں۔

ہینڈ سیٹ کا باڈی پر رکھتے ہی لہروں کا کھیل ختم اور باتوں کا سلسلہ منقطع۔

بیسویں صدی میں ٹیلی فون سسٹم نے بے تحاشا ترقی کی۔ میلوں لمبے تار، بھاری بھرکم ٹیلی فون سیٹ، گھنگھناتی گھنٹی، گھُر گھُراتا ڈائیل ٹون اور کھرکھراتی آواز وغیرہ۔ سب کے سب ہوا ہوائی ہوگئے۔ الیکٹرانکس کے چپس، کمپیوٹر کے کمال اور سیٹلائٹس کے لانچ نے ٹیلی فونی میں وہ انقلاب پیدا کردیا کہ بس ہوگئی دنیا مٹھی میں۔

ہندوستان میں ٹیلی فون کی شروعات:

اپنے ملک میں ٹیلی فون کی شروعات بمبئی (آج کے ممبئی) سے ہوئی جہاں 1882 ایک پرائیویٹ کمپنی نے چھوٹا سا ٹیلی فون ایکسچینج بنایا۔ ساتھ ہی ساتھ کلکتہ (کولکاتا) اور مدراس (چنئی) میں بھی ایکسچینج لگے۔ یہ بیس بیس نمبروں کے چھوٹے چھوٹے، میگنیٹو ایکسچینج تھے اور بہت بڑی ہستیوں کے پاس ہی ان کے کنکشن ہوتے تھے۔

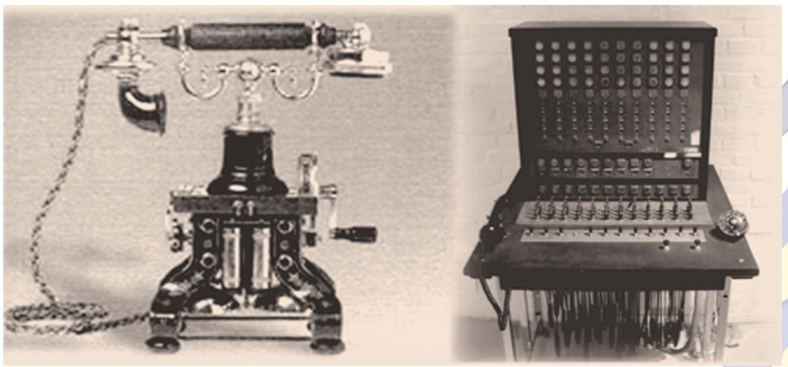

ہندوستان میں استعمال ہونے والے پہلے ٹیلی فون اور ایکسچینج

1907 میں کانپور (آج کے یوپی یعنی اتر پردیش اور اس وقت کے یوپی یعنی 'یونائیٹیڈ پروونسز آگرہ اودھ' میں سرکاری ٹیلی فون ایکسچینج بیٹھایا گیا۔ کانپور آج بھی یوپی کا سب سے بڑا ٹیلی فون نیٹ ورک ہے۔ 1947 تک یوپی میں کل بیالیس ٹیلی فون ایکسچینج کھل چکے تھے جن کے سبسکرائبرز یعنی گاہکوں کی تعداد تیرہ سو تھی۔

پورے ہندوستان میں آزادی کے وقت کل 321 ایکسچینج اور ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار نمبر تھے۔ اور آج کی تو بات ہی نرالی ہے۔

ٹیلی فون سسٹم میں ٹرانس مشن میڈیا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں ایک مقام سے دوسرے مقام کے لیے دو تاروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس طرح اگر ایک سرکٹ (راہ) کے لیے دو تار کھینچے جاتے تو آسمان کے نیچے تاروں کا جال بچھ جاتا۔ 1918 میں تاروں کے ایک جوڑے پر بارہ جوڑے لوگوں کے بات کرنے کے لیے ملٹی پلیکس سسٹم لگایا گیا۔

دوسری عالمی جنگ عظیم کے وقت 1940 میں لوہے یا تانبے کے تاروں کے بجائے کوایکسئل کیبل ایجاد ہوئی اور 1950 میں ایک جوڑے تار پر چھ سو سرکٹ بن گئے جو آگے چل کر 1960 تک چھ ہزار سرکٹس تک بڑھ گئے۔ Overhead Wire Micro Tower, Under ground Cable کے بعد اب Sattelite Communication کی بدولت سرکٹ کی کوالٹی اور کوالٹی میں اتنی ترقی ہوئی کہ دوسرے ملک میں بیٹھا ہوا آدمی گویا بغل میں بولتا ہوا سنائی پڑتا ہے۔

ٹیلی فون اور اس کے متعدد اجزا اور گل پرزے بنانے کی ایک بہت بڑی فیکٹری انڈین ٹیلی فون انڈسٹری یعنی آئی ٹی آئی بنگلور کا بھی بھارت کے پبلک سیکٹر میں اہم مقام ہے۔ اس کمپنی کی چھ اکائیوں میں سے یوپی کے الہ آباد شہر سے تقریباً پندرہ کلومیٹر پر واقع نینی نامی مقام پر آئی ٹی آئی نینی مختلف قسم کے ٹرانس مشن کے پرزے تیار کرتی ہے۔ 1971 میں اس نے اپنا پروڈکشن شروع کیا اور ملک کے اندر کی ضرورتیں پوری کرنے کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی ایکسپورٹ کرتی ہے۔ نئے زمانے اور نئی ضرورتوں کے مدِ نظر آئی ٹی آئی

موبائل کا ارتقا

قائم رکھتے ہوئے محض ٹیلی فون ہی نہیں بلکہ ریڈیو اور ٹی وی کی بہتر نشریات کو بھی ممکن بناتا ہے۔ بھارت میں دو بڑے ارتھ اسٹیشن دہلی اور مدراس میں قائم ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ چھوٹے مراکز پورٹ بلیئر، نکوبار، کاوارتی (کچھ دیپ) لیہہ (کشمیر) اور شمالی مشرقی علاقے میں قائم کئے گئے ہیں۔

کا ایک ٹیکنیکل اینڈ ڈیولپمنٹ ونگ بھی مدھیہ پردیش کے جبل پور شہر میں قائم کیا گیا ہے۔ نینی کے علاوہ یوپی کے ہی رائے بریلی، منکاپور (ضلع گونڈا) کشمیر کے سری نگر اور کیرل کے پال گھاٹ میں آئی ٹی آئی بنگلور کی فیکٹریاں ہیں۔

ٹیلی فون کی کہانی پوری ہونے سے قبل چند الفاظ اگر آواز کی خلائی پرواز کے سلسلہ میں بھی تحریر کردئے جائیں تو دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

کرۂ ارض کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک کے گھنے جنگلوں اونچے پہاڑوں اور گہرے سمندروں سے ہوکر جانے والی دشوار راہوں کے آر پار انسانی آواز کا ہو بہو اسی انداز اور لہجہ میں گوش گذار ہونا ممکن ہو پایا ہے مصنوعی سیاروں کی بدولت جن کو ہندوستان کی طرف سے خلا میں بھیجنے کی شروعات انسیٹ ۔1A کے ذریعہ گذشتہ صدی میں ہی کردی گئی تھی۔ چھتیس ہزار کلومیٹر کی اونچائی پر خلا میں گردش کرتا ہوا مصنوعی سیارہ زمین کے ارتھ اسٹیشن سے رابطہ

تیزی سے بدلتی ہوئی موبائل فون کی تصویر!

انیسویں صدی کے اواخر میں گراہم بل کے بل یعنی گھنٹی کی ٹرنگ ٹرنگ نے آج کی اکیسویں صدی کے ہیلوٹیون کی اتنی شکلیں اختیار کرلی ہیں کہ جن کا شمار نہیں۔ شاستریہ ہو یا فلمی موسیقی، بھجن ہو یا قوالی اور غزل گیت ہو یا برہا کجری، کوئی بھی دھن کوئی بھی بول آپ سنتے رہئے، جب تک دوسری طرف جواب نہیں آجاتا یا پھر جواب نہ ملنے کا سگنل نہیں آجاتا۔ یہ سب کمالات ہیں ٹیلی فون کے منی اوتار Mini Avatar یعنی موبائل کے۔ نہ ڈائل ٹون کی گھر گھراہٹ نہ ڈائل گھمانے کی کھرکھراہٹ۔ بس پش بٹن دبایئے، نمبر ملایئے اور ابو امی، چچا چچی اور بھائی جان، آپا جان، چاہے جس سے دعا سلام، گپ شپ اور چیٹ ویٹ کرلیجئے۔ بس اب یہ کہانی ختم، سوئچ آف اور شب بخیر۔

♦ ٹی این سریواستو، رئیس پٹھاری 32 سینٹ جانس کالونی مڑھولی
پوسٹ بھولن پور وارانسی۔221108

نظم

□ محبوب راہی

جنگل میں منگل

کوّے نے کی جاکے منادی
منڈپ سورج کی کرنوں کا

مینا رانی کی ہے شادی
جس پر رقص ہوا ہرنوں کا

چڑیاں ساری ہنستی گاتی
شیر ببر نے عقد کرایا

بن کر آئی ہیں باراتی
کبوتروں نے سہرا گایا

گھوڑے آئے ہاتھی آئے
لومڑی بی اور بلی خالا

بے گنتی باراتی آئے
دونوں نے سب کام سنبھالا

پہلے سب نے کھانا کھایا
چیتل، سانبھر، بارہ سنگھا

پھر مل جل کر گانا گایا
گدھا، تیندوا، لکڑ بھگّا

بلّی بینڈ بجاتی آئی
چوہا، اونٹ، خرگوش اور کچھوا

کوئل نے چھیڑی شہنائی
بھینس، گائے، بکری اور کتا

بندر آئے ڈھول بجاتے
بیل، ریچھ، بھینسا اور خچر

بھالو آئے ناچ دکھاتے
جمع ہوگئے سبھی جانور

جھوم کے ناچے مور چھما چھم
دھوم دھام سے ہوگئی شادی

خوب مچایا شور چھما چھم
دلہا دلہن کو سب نے دعا دی

مینا لے کر ہلدی آئی
گونج اٹھا سب جنگل راہی

دوڑ کے جلدی جلدی آئی
جنگل میں تھا منگل راہی

♦ ڈاکٹر محبوب راہی، نرسی ٹکلی، ڈسٹرکٹ اکولہ، مہاراشٹر 444401

عظیم اقبال

بدلے کی آگ

بہت دن ہوئے، تب دنیا میں ہر طرف گھنے جنگل تھے، سبزہ زار تھے، ہری بھری وادیاں تھیں، جنگلوں میں مختلف طرح کے جانور رہتے تھے۔ شیر، چیتا، بھیڑیا، ریچھ، بندر، لومڑی، ہاتھی، گھوڑا۔ سب بے فکری سے رہتے تھے۔ جدھر جی چاہتا نکل جاتے۔ کھاتے، پیتے، موج مستی سے دن رات بتاتے۔

انہی دنوں گھوڑے کی ملکیت والی اس حسین لمبی چوڑی زمین بھی پھیلی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سرسبز خطے پر نرم ملائم گھاس چرتے ہوئے، وہ چوکنا رہتا۔ دوڑنے اور قلانچیں بھرنے کی بجائے وہ آہستہ سے اور نرمی سے قدم اٹھاتا اور سنبھل سنبھل کر چلتا۔ جدھر نگاہ اٹھاتا، سرسراتی، جھومتی ہوئی گھاس کی اپج پر اپنی ملکیت کا اندازہ کر کے اسے بے حد سکون ملتا تھا۔ اپنی اس جائداد پر اسے بڑا ناز تھا۔ قدرت بھی اس پر مہربان تھی۔ آس پاس اکثر سوکھا رہتا اور کبھی کبھی زمین پر ایک تنکا بھی نہیں اگتا۔ لیکن گھوڑے کی زمین میں کبھی ایسی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اس کی دھرتی پر صدا ہریالی چھائی رہتی۔ گھوڑے کے مزے ہی مزے تھے۔ اسے حال کی فکر تھی نہ مستقبل کی۔ اسے کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دنیا کی رونق سے وہ بیگانہ تھا۔ جی بھر کھانے اور جی بھر سونے کے علاوہ اس کا دوسرا کوئی کام نہیں تھا۔

گھوڑے کی پُرسکون زندگی میں طوفان اس وقت آیا، جب ایک صبح اس نے اپنی زمین کو اجڑا ہو پایا۔ جس سبزے پر قدم رکھتے ہوئے وہ بے حد احتیاط برتتا تھا، اسے کسی نے بے رحمی سے روند ڈالا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کے پاؤں میں اینٹھن ہونے لگی۔ تلملاہٹ میں زمین پر ٹاپ مارتے

ہوئے وہ ہنہنا اٹھا۔

طیش نے اس کی بھوک مٹا دی۔ اس کی نیند اڑا دی۔ اس کا گھومنا، پھرنا دوبھر ہوگیا۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ دشمن کا خاتمہ کیے بغیر وہ بھوکا، پیاسا رہے گا۔ پل بھر آرام کرے گا نہ چین کی سانس لے گا۔

جنگل میں دوسرے رہنے والوں سے میل جول نہ ہونے کے سبب کسی سے اپنا دکھ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا وہ عادی نہیں تھا۔ اس لیے اس کا کوئی غم بانٹنے والا تھا نہ ہم درد۔ بے چارہ جاتا تو کہاں جاتا؟

انتقام لینے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ دشمن کی کھوج کی جائے۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، آتے جاتے جانوروں پر نگاہ ڈالی۔ شک شبے سے ہر ایک کو دیکھا۔ وہ تاک میں تھا کہ اچانک ایک دن بارہ سنگھا، چھلانگ لگاتا اور قلانچیں بھرتا ہوا آیا اور شمال سے جنوب کی طرف چھلاوے کی طرح نکل گیا۔ گھوڑے کی آنکھوں کے سامنے اس کی جا گیر پھر روندڈالی گئی۔ اس پر وہ سکتے میں رہ گیا۔ وہ اتنی تکلیف میں تھا کہ بارہ سنگھے کا پیچھا کرنے کو وہ تھوڑے فاصلے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر بھی اپنے دشمن کی تیزی کے سامنے ہار تسلیم کرنے کو وہ تیار نہیں تھا۔

بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے گھوڑے نے طے کیا کہ وہ دشمن کا صفایا کردے گا۔ اس کا سارا غرور چکنا چور کرکے ہی اسے چین آسکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ دشمن کے خاتمے تک آرام نہیں کرے گا۔

دشمن کو ہرانے کا منصوبہ بناتے وقت اسے خیال آیا کہ اس کام میں آدمی کی مدد لینی ہوگی۔ آدمی میں بے پناہ طاقت ہے۔ اس سے سارے ہی جاندار پناہ مانگتے ہیں۔ لہٰذا وہ آدمی کے سامنے پیش ہوا اور اپنا مدعا بیان کیا۔

آدمی نے گھوڑے کی طرف تجسس بھری نگاہ ڈالی۔ اس نے گھوڑے کا مضبوط اور گٹھا ہوا جسم دیکھا، جنگل میں شیر، چیتے اور ہرن کا شکار کرتے ہوئے اس نے تھوڑے سے فاصلے سے گھوڑے کو بارہا دیکھا تو تھا، لیکن اتنے قریب سے اسے دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کو چھوا، دھیرے دھیرے اس کی گردن سہلاتا رہا۔ گھوڑے نے اپنے کانوں کو حرکت دی اور اپنی دم ہلائی۔ آدمی کا ہاتھ سے چھونا اسے اچھا لگا۔ آدمی نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ آدمی نے گھوڑے کے آگے، پیچھے گھوم کر اس کے بدن کو جگہ جگہ ٹٹول کر دیکھا۔ گھوڑا سر جھکائے کھڑا رہا۔ جب کبھی آدمی کا ہاتھ اس کے جسم سے مس ہوتا، اس کے بدن میں جھرجھری دوڑ جاتی۔ اس کو جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد بھی آدمی نے اپنی چپ نہ توڑی تو گھوڑا اس سے مخاطب ہوا۔

''جناب! میں بدلے کی آگ میں جل رہا ہوں۔ جیسے بھی ہو، میری مدد کیجئے۔''

آدمی نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے، ''دوست! مدد کے لیے میں تیار ہوں، تمہارے لئے کچھ بھی کر کے مجھے خوشی ہوگی۔''

گھوڑے نے دم ہلائی اور رندھے گلے سے بولا۔

''محترم! آپ کا احسان میں کبھی نہ بھولوں گا۔ ساری زندگی آپ کے گن گاؤں گا۔''

آدمی نے گھوڑے کی ایال اپنی مٹھی میں بھری۔

''بھائی! کسی پر کوئی مشکل آجائے تو اسے آسان کرنے میں ہاتھ بٹانا احسان نہیں ہے۔ حاجت مند کی حاجت پوری ہوجائے۔ آدمیت کا یہی تقاضہ ہے۔''

گھوڑے نے گردن اٹھائی، زمین پر پاؤں مارا اور ہنہنانے لگا۔ آدمی نے اس کے زخم پر ہمدردی کا جو مرہم رکھا تھا اس کا وہ ایسے جواب دے سکتا تھا۔

اگلی صبح پَو پھٹنے سے پہلے ہی آدمی نے گھوڑے کے منہ میں لگام ڈالی، اس کی پیٹھ پر زین کسی اور پھلانگ کر اس پر سوار ہوگیا۔

گھوڑے کو سب کچھ عجیب سا لگا لیکن اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ پہلے تو اس کے پاؤں لڑکھڑائے، لیکن دھیرے، دھیرے اس کے قدموں میں مضبوطی آگئی۔

ایڑ لگاتے ہی گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔ دھوپ میں تیزی آنے سے پہلے ہی وہ دشمن کے ٹھکانے تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کھلے میدانوں، لق ودق صحراؤں، پہاڑوں، ندیوں سے گذرتا ہوا وہ منزل کی جانب رواں دواں رہا۔

جب بھاگتے ہوئے بارہ سنگھے پر آدمی نے اپنا نیزہ پھینکا تو اس کا نشانہ چوکا نہیں۔ کچھ دور لڑکھڑا کر بارہ سنگھا زمین پر گر گیا۔ اس کو تڑپتا دیکھ کر گھوڑے کو قرار آگیا۔ انتقام کے شعلے بجھ گئے۔ اس نے چین کی سانس لی۔

آدمی نے بارہ سنگھے کے مردہ جسم سے نیزہ نکالا۔ گھوڑے کی لگام تھامی اور پھلانگ کر اس پر سوار ہوگیا۔

اس بار ایڑ لگانے پر گھوڑے نے دوڑنا شروع نہیں کیا تو آدمی اس کی کمر پر تابڑ توڑ چابک برسانے لگا۔ احتجاج بے سود تھا۔ آدمی اس پر سوار تھا۔ گھوڑے کے سامنے دوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

کہتے ہیں اس دن سے گھوڑے کی زندگی میں ایک نیا موڑ آگیا، اس کی آزادی جاتی رہی اور اس نے آدمی کی غلامی قبول کرلی۔ □

♦ عظیم اقبال دبستان گنج نمبر ایک، بیتیا، بہار۔845438

□ جی انیس احمد

دو بھائی

بھائی سے بھائی کے پیار کی
دل کو چھو لینے والی کہانی

کسی گاؤں میں دو بھائی تھے۔ان دونوں میں سچی محبت تھی۔ان کے پاس اور جائداد وغیرہ تو کچھ نہیں تھی صرف ایک باغ تھا جو انھیں باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔یہی باغ دونوں کے لئے قیمتی سرمایہ تھا۔

دونوں بھائیوں میں اتنی الفت تھی کہ انھوں نے اس باغ کو آپس میں بانٹنا مناسب نہ سمجھا اور باغ میں خوب محنت کرکے پھلوں کے پیداوار کو دوگنا کردیا۔دونوں بھائیوں نے ان پھلوں کو آدھا آدھا بانٹ لیا۔

اسی طرح ہر سال ان کی محنت رنگ لاتی اور پیداوار میں تین گنا اور چوگنا اضافہ ہوتا گیا۔

اس دوران بڑے بھائی کی شادی ہوئی اور پھر اس کے دو بچے ہوئے ۔ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔وہ بہت خوش تھا اور اس خوشی میں اس کا چھوٹا بھائی بھی برابر شریک رہا۔

الغرض دونوں بھائی ہر سال باغ میں خوب محنت کرتے اور پھلوں کی پیداوار کر بڑھانے کی فکر میں رہتے تھے اور جو فصل تیار ہوتی اس کو آدھا آدھا بانٹ لیتے تھے۔ایک رات چھوٹا بھائی سونے کے لیے بستر پر لیٹا۔

مگر اس کو نیند نہ آئی۔ وہ کچھ پریشان ادھر ادھر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس نے سوچا ''میرے بڑے بھائی کے بیوی اور بچے ہیں۔ ان کو پالنے کی ذمہ داری بھائی پر ہے۔ لیکن میں اکیلا ہوں اور پھر مجھے کوئی مسئلہ بھی درپیش نہیں ہے۔ میں جو محنت کرتا ہوں وہ میری تسلی کے لئے ہے۔ میں کتنا خودغرض بن گیا ہوں کہ پیداوار کا آدھا حصہ میں نے اپنے لیے لے لیا جب کہ بڑے بھائی کے ساتھ تین اور افراد ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے اور یہ انصاف بھی نہیں ہے۔''

چنانچہ وہ پریشان ہوکر بستر سے اٹھا اور اپنے حصہ کے پھل میں سے ایک ٹوکرا پھلوں سے بھر کر خاموشی کے ساتھ چلا اور بڑے بھائی کے حصہ کے پھل میں ڈال کر واپس آیا۔ تب جا اس کی فکر اور پریشانی دور ہوئی اور وہ کسی قدر سکون سے سو پایا۔

اسی رات اس کا بڑا بھائی بھی سو نہ سکا۔ اس کو چھوٹے بھائی کے تعلق سے پریشانی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا ''میرا چھوٹا بھائی اکیلا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے کوئی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ میرے ساتھ بیوی بچے ہیں۔ جو میری دیکھ بھال کریں گے۔ یہ سراسر ناانصافی ہوگی کہ فصل کو ہم دونوں آدھا آدھا بانٹ لیں۔''

وہ اپنے بستر سے اٹھا ایک ٹوکرے میں پھل بھر کر چھوٹے بھائی کے حصہ میں ملا کر خاموشی کے ساتھ بستر پر آکر لیٹ گیا۔

دوسرے دن سویرے دونوں بھائیوں نے دیکھا کہ ان کے حصہ کا پھل ویسا ہی ہے جیسا انھوں نے آدھا آدھا بانٹا تھا اور دونوں کو اس میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

دونوں بھائیوں کو اچھی طرح یقین تھا کہ گذشتہ رات کچھ پھل ادھر سے ادھر بدلا ہے لیکن دونوں نے آپس میں کچھ نہیں کہا۔

دوسری رات بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ دونوں نے ایک ایک ٹوکرا پھل اپنے حصہ میں سے نکال کر اپنے مقابل بھائی کے حصہ میں ملا دیا اور صبح کو دیکھ کر ان کے حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان دونوں کے حصہ میں کوئی کمی نہیں آئی۔

پھر تیسرے دن دنوں بھائی پھل کا ٹوکرا بھر کر مقابل بھائی کے حصہ میں ملانے کے لیے نکلے لیکن اتفاق سے دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ جب دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تو پھل کے ٹوکروں کو نیچے رکھ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور دونوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہوگئے۔ دونوں کو معلوم ہوگیا کہ گذشتہ دو راتوں میں کیا ہوا تھا۔ یہ انتہائی محبت اور پیار کا حسین لمحہ تھا۔ کچھ دیر بعد دونوں آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے بستر کی طرف چلے گئے۔ □

♦ جی انیس احمد، 24 ایس آر، اسٹریٹ میل وشارم 632509

❑ نکہت پروین

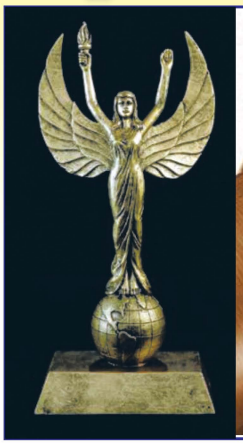

انعام

وہ ماں کا بہت پیارا تھا۔ سیر وتفریح کی اس کو ماں کی طرف سے مکمل آزادی تھی۔ ویسے بھی وہ امیر ترین گھرانے کا چشم وچراغ تھا۔ باپ دادا کی چھوڑی دولت اس کی پوری زندگی کے لئے کافی تھی۔ دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ باپ داد کی میراث پر عیش کرتے ہیں اور ان کی پوری زندگی عیش ونشاط سے گذر جاتی ہے۔ یہ لوگ نہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور نہ ہی محنت ومشقت کے عادی ہوتے ہیں۔ خالد کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، ہوش مند ہوتے ہی وہ برے لڑکوں کی سنگت میں پڑ کر خراب ہوگیا۔ اکلوتا بیٹا تھا اس لئے ماں اسے کچھ نہیں کہتی تھی۔ اس کے والد گھر سے بہت دور کسی سرکاری محکمہ میں آفیسر تھے۔ گھر کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ ایک دفعہ خالد کو اس کے والد ہزاری باغ اپنے ہمراہ لے گئے، لیکن ایک مہینہ بھی وہ وہاں نہیں رہ سکا۔ ماں نے خالد کو بہت سمجھایا۔ بیٹا! تعلیم انسان کا جوہر ہے، تعلیم سے عزت ہے، شوکت ہے، مگر ماں کی نصیحت کا کبھی خالد پر اثر نہ ہوا۔ ماں چاہتی تھی کہ اس میں کسی طرح اچھے برے کی تمیز آجائے۔ ماں اس کو اسکول بھیجتی اور وہ سیدھا بازار چلا جاتا۔ ماں اس کو اسکول خرچ کے لیے روز پیسے دیتی اور وہ اس پیسے سے سنیما کے ٹکٹ خریدتا۔ شام کے 4 بجے سے رات 8 بجے تک وہ فلمیں دیکھ کر گھر واپس آتا۔ ماں خالد کے مستقبل کے لئے بے چین تھی، چونکہ اس کی ممتا اس کے غصہ پر حاوی تھی اور وہ خالد کو کبھی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتی تھی۔ پھر بھی فکر تو رہتی ہی تھی۔

وقت گذرتا رہا، خالد کا چلن نہ بدلا۔ رفتہ رفتہ اس کا خرچ بڑھ گیا۔ ماں نے ہاتھ سمیٹ لئے۔ خالد نے زمین پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے ساری زمینیں بک گئیں، کل تک جس گھر میں سیکڑوں من اناج آتا تھا، وہی گھر دانے دانے کو محتاج ہوگیا۔ اسی پر بس نہیں، خالد کو کام دھندے سے مطلب نہ تھا۔ خاندانی غریب لڑکے تو محنت ومزدوری کرکے اپنے گھر والوں کا پیٹ پال لیتے

ہیں۔مگر امیر گھرانے کے بچے...مفلس ولاچار ہوجانے کے بعد بھی محنت مزدوری نہیں کرتے کیونکہ وہ سوچتے ہیں اس سے ان کی شان گھٹ جائے گی۔خالد کا بھی یہی حال تھا۔وہ روز باسی روٹی کھا کر پانی پی لیتا،صبح سے شام تک ادھر ادھر گشت کرتا۔شام کو گھر آ کر جو کچھ میسر ہوتا کھا پی کر سو جاتا،یہی اس کا روز کا معمول تھا۔

ماں نے خالد کی شادی کردی تا کہ وہ کچھ سدھر جائے لیکن شادی کے بعد بھی وہ اپنے حال پر برقرار رہا۔جب دو بچے ہوگئے تھے تو ماں نے سوچا اب یہ ضرور سدھر جائے گا۔مگر وہ نہ سدھرا۔اس کے دادا نے اپنی کئی بیگھہ زمینیں اونے پونے معمولی رقم کے بدلے دوسروں کو دے دی تھیں اور رجسٹری نہیں کی تھیں۔خالد نے ان زمینوں پر اپنا ہاتھ صاف کیا۔جو لوگ ان زمینوں پر قابض تھے۔اس کے دشمن بن گئے اور مقدمہ کی نوبت آئی۔ خالد نے ان زمینوں کے پیسے سے کیس لڑے اور گھر کا خرچ پورا کیا۔اس کی زندگی کی گاڑی کچھ عرصے تک اسی طرح چلتی رہی مگر پرائے دھن سے وہ کتنے دن عیش کرتا۔ یہ ساری زمینیں بھی جب بک گئیں تو وہ پھر دست نگر ہوگیا۔اب اس کی عقل میں کچھ بات آئی،اس نے گاؤں میں ایک چھوٹی پرچون کی دوکان ڈال دی،جس سے اس کے گھر کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ خالد نے دوکان کے لیے بیشتر چیزیں مارکیٹ سے ادھار لیں۔ بیوپاریوں نے بڑے باپ کا بیٹا تصور کر کے ادھار دینے سے کبھی انکار نہ کیا۔گاؤں میں اس کی دوکان خوب چلی۔لیکن آمدنی کچھ زیادہ نہ تھی۔بس گھر کا خرچ چل جاتا تھا۔قرض زیادہ ہونے کے بعد جب بیوپاریوں کے تقاضے شروع ہوئے تو اس کے ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ اس نے دوکان کی ساری چیزیں اونے پونے داموں میں فروخت کر کے ان بیوپاریوں کا قرض چکا دیا۔اب خالد گھر کا تھا نہ گھاٹ کا۔ پہلے کی طرح وہ پھر کنگال ہوگیا۔گھر میں فاقہ کشی،بچے بیمار اور خود بھی نحیف و ناتواں ہوگیا،حالانکہ ابھی اس کی عمر 30 سال سے زیادہ نہ تھی۔اس کے باوجود 60 سال کا لگتا تھا۔

خالد نے پرائمری اسکول تک تعلیم حاصل کی تھی،ماسٹر صاحب

خالد کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، ہوش مند ہوتے ہی وہ برے لڑکوں کی سنگت میں پڑ کر خراب ہوگیا۔ اکلوتا بیٹا تھا اس لیے ماں اسے کچھ نہیں کہتی تھی۔

اسے کچھ لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا۔اس میں اتنی لیاقت نہ تھی کہ کوئی کہانی، افسانہ لکھ سکے۔شروع میں تو وہ بے ربط جملے لکھتا رہا،تاہم لکھتے لکھتے اسے لکھنا آ گیا۔اس نے ایک دلچسپ کہانی لکھی تھی جو کہ دہلی کے ایک اردو میگزین میں چھپی ۔ قارئین نے اس کہانی کو بہت پسند کیا تھا۔اس کہانی کے علاوہ اس نے اور کوئی کہانی نہیں لکھی، کیونکہ اسے کوئی تعریفی خطوط موصول نہیں ہوئے۔اسی لیے مزید لکھنے کا شوق پیدا نہ ہوا۔وہ کہانی چھپی یا نہیں چھپی اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

اس بیچ خالد کے گھر میں فاقہ کشی جاری تھی،بیوی اپنے زیورات بیچ کر کچھ دنوں گھر کی ضرورتیں پوری کرتی رہی۔اس نے خالد کو نصیحت کی کہ ان پیسوں سے وہ کوئی تجارت کرے تا کہ زیورات کے یہ سارے پیسے کھانے پینے میں ہی خرچ نہ ہوجائیں۔خالد کوئی تجارت کی بات سوچ رہا تھا۔وہ گھر سے نکل کر ایک چائے کی دوکان پر گیا

وہاں اس نے اخبار میں ایک اعلان پڑھا۔ یہ افسانہ نویسوں، شاعروں کے لئے ایوارڈ کا اعلان تھا۔ اس کو اپنی لکھی کہانی یاد نہیں تھی۔ وہ عموماً وقت گذاری کے لئے مختلف محفلوں میں شریک ہوتا، تاکہ کچھ گھڑی کے لئے ہر فکر سے آزاد ہوجائے۔ اس لیے وہ اخباری اعلان کے مطابق مقررہ تاریخ کو کرشن میموریل ہال پہنچ گیا جہاں اسے پچھلی سیٹوں پر جگہ ملی۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ایک کے بعد ایک ایوارڈ کے لیے ناموں کا اعلان ہوا، خالد کو اس وقت بے حد حیرانی ہوئی جب گیارہویں نمبر پر غیر معمولی تعریف و توصیف کے بعد منشی پریم چند ایوارڈ کے لئے خالد کے نام کا اعلان ہوا۔ خالد ہکا بکا سب کا منہ دیکھنے لگا۔ اناؤنسر نے بار بار اس کا نام پکارا، اس نے سوچا، اس کا ہم نام کوئی اور شخص ہوگا تاہم جب اناؤنسر نے خالد کا پورا پتہ پڑھ کر سنایا تو اسے یقین ہوگیا کہ یہ اس کا نام ہے۔ وہ اپنی جگہ سے شرماتا ہوا اٹھا، اس کے جسم پر پھٹے پرانے لباس تھے، وہ سیدھا اسٹیج تک پہنچا۔ لوگ اسے دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ ناظم نے اس کی ہمت افزائی کی اور اس کا تعارف کرایا۔ حضرات! یہ قابل ترین کہانی نویس ہیں، عموماً ہمارے ادیب اور فنکار اسی طرح عجیب حال میں نظر آتے ہیں جو کہ ہر خوش نمائی سے بے تعلق ہوکر ملک وقوم کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر چکے ہوتے ہیں۔ پھر بڑے افتخار واعزاز سے ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم نے خالد کو بیش قیمت سونے کا تمغہ اونی شال اور 50 ہزار کی رقم حوالہ کی، خالد نے پوز دیئے اور فوٹو گرافروں نے اس کی تصویریں اتاریں۔ دوسرے دن اخبارات میں ایوارڈ لیتے ہوئے اس کی تصویریں شائع ہوئیں۔ ٹیلی ویژن پر اس کے منظر دکھائے گئے۔

خالد شام کو خوشی خوشی اپنے گھر آیا اور سوچ میں غرق رہا کہ آخر یہ کس کہانی کا اسے صلہ ملا ہے۔ اسے یاد آیا کہ آج سے بیس برس پہلے اس نے ایک کہانی لکھی تھی۔ اس نے اپنے دل میں کہا، بزرگوں نے صحیح کہا ہے 'نیکی کر دریا میں ڈال' اس نے اپنا پرانا صندوق کھولا پرانے کاغذات الٹ پلٹ کیے۔ ان ہی کاغذات میں وہ کہانی مل گئی جس کا عنوان تھا 'گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں' خالد کی یہ کہانی خود خالد کے لیے بھی سبق آموز کہانی تھی۔ اس کی زندگی کا کل تخلیقی سرمایہ بس یہی ایک کہانی تھی جس کے طفیل اسے 50 ہزار کی نقد رقم، شال اور تمغے نصیب ہوئے تھے۔ اب اس کے ہاتھ پاؤں کمزور ہو چکے تھے۔ اس کے سوچنے کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ وہ کچھ اچھا لکھنے پڑھنے سے قاصر تھا۔ وہ صرف اتنا سوچ سکتا تھا کہ کاش یہ خیال پہلے آیا ہوتا۔ اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا... □

♦ نگہت پروین 102 اشوکا پلازہ، فرسٹ فلور، حیدرآباد، اے پی۔ 500028

وکیل نجیب

ٹفن باکس

دردمند لوگوں کی پرعزم کہانی

نعیم انٹرمیڈیٹ پاس کر چکا تھا۔ تھرڈ کلاس میں پاس ہوا تھا۔ اس لیے کہیں نوکری نہیں مل رہی تھی۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بڑی بہن تھی جس کی دوسرے شہر میں شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ مزے میں اپنے گھر رہ رہی تھی۔ ادھر نعیم کے گھر کا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ اس کے والد کی پینشن 2 ہزار روپے مہینے آتی تھی۔ اس کی ماں کچھ کام کر لیتی تھی بس اسی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ نعیم کو نہ تو کام کرنے کا شوق تھا اور نہ وہ دل سے کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔ ایک دو جگہ ماں کے کہنے پر لگا بھی لیکن بے قاعدگی اور لاپرواہی کی وجہ سے اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ ماں کے بار بار کہنے پر بھی اس نے کچھ کام کرنے، کچھ پیسہ کمانے کے متعلق سنجیدگی سے نہیں سوچا۔

ایک دن اس کی بہن کے گھر سے یہ دکھ بھری خبر آئی کہ اس کے بہنوئی کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ یہ خبر نعیم کی ماں پر بجلی کی طرح گری۔ وہ بے تحاشہ رونے لگیں۔ نعیم کو خبر ملی تو وہ بھی دوڑتا بھاگتا گھر آیا۔ ماں کو تسلی دینے لگا۔ اس کی بہن جس شہر میں رہتی تھی وہ بہت دور تھا۔ نعیم کی ماں اس دکھ کے موقع پر اپنی بیٹی کے گھر جانا تو چاہتی تھی لیکن ایک تو ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، دوسرے اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ دونوں ماں بیٹے وہاں جا پاتے۔ اس مصیبت کی گھڑی میں وہ اپنی بیٹی کی کچھ مدد کرنا چاہتی تھیں ان کے پاس ایک سونے کا ہار تھا۔ نعیم کے ابو کو ایک بار تنخواہ میں اضافے کی 3 سال کی بقیہ رقم ملی تھی۔ اس سے انھوں نے سونے کے ایک ہی جیسے 2 ہار بنوائے تھے۔ ایک انھوں نے اپنی بیوی کو دیا اور دوسرا انھوں نے اپنی بیٹی کو دیدیا تھا۔ نعیم کی والدہ کا وہ ہار بہت دنوں سے ایک بکسے میں بند پڑا ہوا تھا۔ نعیم کو اپنے ساتھ لے جا کر انھوں نے وہ ہار سنار کو بیچ دیا اور اس سے ملنے والے پیسے انھوں نے ایک اسٹیل کے چھوٹے ٹفن باکس میں رکھ دیے۔ آنے جانے کے خرچ کے لئے پانچ سو روپے نعیم کو دیے۔ اس کے کچھ کپڑے اور کھانے کا سامان اور اسٹیل کا ٹفن باکس ایک تھیلی میں رکھ دیا اور اسے اپنی بیٹی کے گھر روانہ کر دیا۔ نعیم سے کہہ دیا کہ وہ ڈبہ کہیں نہیں کھولے گا اور اپنی بہن کے ہاتھ میں دے گا۔

نعیم ریلوے اسٹیشن پر آیا اس نے اپنی بہن کے شہر کا ٹکٹ لیا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔ دوسرے دن صبح ٹرین اس کی بہن کے شہر پہنچ گئی۔ وہاں سے وہ بس میں بیٹھ کر بہن کے گھر گیا۔ بہن نے بھائی کو دیکھا تو اس سے لپٹ گئی اور

دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ گھر میں موجود لوگوں نے نعیم کی بہن کو دلاسہ دیا، تسلی دی، بڑی مشکل سے وہ خاموش ہوئی۔ دوسرے دن فاتحہ وغیرہ پڑھائی گئی۔ قرآن خوانی ہوئی۔ قبرستان میں جا کر اس کے بہنوئی کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر سب لوگ گھر واپس آ گئے۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ بھائی نے بہن سے اپنے گھر کی بگڑی ہوئی حالت کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ کافی کوشش کے بعد بھی اسے کہیں نوکری نہیں مل رہی ہے اور یہ بھی کہا کہ بغیر کچھ لیے دیے کہیں کوئی نوکری ملنا مشکل ہے۔

دو تین دن رک کر نعیم اپنے گھر جانے کو ہوا تو اس کی بہن نے اسے ایک اسٹیل کا ٹفن باکس دیا اور کہا کہ یہ ٹفن باکس امی کو لے جا کر دینا راستے میں اسے بالکل نہیں کھولنا۔ اس کی بہن نے ٹفن باکس دیا تو نعیم کو ماں کے دیے ہوئے ٹفن باکس کا خیال آیا۔ اس نے وہ ڈبہ جو تھیلی میں نیچے رکھا ہوا تھا۔ نکال کر بہن کو دیا اور کہا کہ یہ ٹفن باکس ماں نے تم کو دینے کو کہا تھا میں بھول گیا تھا۔ اس کی بہن نے ٹفن باکس ہاتھ میں لیا اور اسے الماری میں رکھ دیا۔ نعیم جب چلنے کو ہوا تو اس کی نظر بہن کے گلے کی طرف گئی اسے سونے کا ہار بہن کے گلے میں نظر نہیں آیا۔ اس نے پوچھا ''باجی تمہارے گلے میں امی کے سونے کے ہار جیسا ایک ہار تھا وہ کیا ہوا؟''

یہ سوال سن کر بہن رونے لگی، بالآخر اس نے کسی طرح ضبط کیا اور کہا ''گھر میں میت ہوگئی ہے، لوگ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں، کوئی کچھ بول نہ دے اس لیے میں نے ہار اتار کر الماری میں رکھ دیا ہے۔''

نعیم نے اپنا سامان اٹھایا۔ ریلوے اسٹیشن آیا اور اپنے شہر کی ٹکٹ لی اور دوسرے دن اپنے گھر پہنچ گیا۔ نعیم کی ماں نے وہاں کے حالات پوچھے اس نے ساری بات تفصیل سے بتادی اور یہ بھی بتایا کہ باجی کے گلے میں جو سونے کا ہار تھا، آتے وقت وہ ہار ان کے گلے میں موجود نہیں تھا۔ پھر اس نے اس کی بہن نے جو ٹفن باکس دیا تھا وہ اپنی ماں کے حوالے کر دیا۔ ماں نے ٹفن باکس کھول کر دیکھا اس میں ہزار ہزار کے کچھ نوٹ رکھے تھے اور چٹھی رکھی تھی۔ اس کی ماں نے چٹھی کھولی، جلدی جلدی پوری چٹھی پڑھ لی اور پھر وہ رونے لگی۔

نعیم نے پوچھا ''اماں کیا ہوا؟''

امی نے چٹھی نعیم کے ہاتھ میں دے دی۔ اس نے وہ چٹھی پڑھی اس میں لکھا تھا کہ میں یہ کچھ روپے نعیم کے ہاتھوں بھیج رہی ہوں۔ ان پیسوں سے نعیم کی کہیں نوکری کا انتظام ہوجائے تو نعیم کی زندگی سدھر جائے گی اور تمہیں بھی کچھ سہارا ہوجائے گا۔ نعیم نے چٹھی پڑھی تو اسے یہ سمجھتے دیر نہیں لگی اس کی بہن کے گلے کا ہار کہاں گیا ہوگا۔ وہ رونے لگا۔

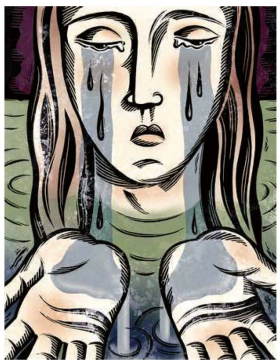

روتے روتے وہ اپنی ماں سے لپٹ گیا اور کہنے لگا ''امی میں کچھ بھی کروں گا، مٹی ڈھونے کا کام کروں گا، گڑھا کھودوں گا، محنت مزدوری کروں گا۔ اب میں بے کار بیٹھ کر اس گھر میں ٹکڑے نہیں توڑوں گا۔ میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گا۔ میرے نکمے پن کی وجہ سے میرے والد کی نشانی دو سونے کے قیمتی ہار بک گئے۔ لعنت ہے میری زندگی پر، میری جوانی پر۔'' اتنا کہہ کر وہ ایک عزم کے ساتھ ایک نئے حوصلے کے ساتھ اٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ □

♦ وکیل نجیب نجیب منزل، نزد لال اسکول، مومن پورہ، ناگپور 440018 مہاراشٹر

□ شکیل جاوید

ہم ایک ہیں

اسکول سے سیدھے گھر آ کر ڈریس اتاری ہاتھ منہ دھویا اور کپڑے بدل لیے۔ چڑیا کے بچّے کے لیے روٹی کا ٹکڑا لے کر چٹکی سے ننھی ننھی گولیاں بنائیں اس کی چونچ کھول کر منہ میں ڈالیں۔ پھر پانی کی ایک آدھ بوند انگلی سے اس کے منہ میں ٹپکائی اور خوش ہو گیا۔ پنجرے میں قید چڑیا کا وہ ننّھا سا خوبصورت بچّہ اس کی طرف پیار بھری گول مٹول آنکھوں سے دیکھ کر پھدکتا جیسے اس سے کہہ رہا ہو، ''اچھے دوست شکریہ!''

تب کہیں جا کر وہ کھانا کھاتا۔ وہ ننّھی سی خوبصورت چڑیا ''چیں! چیں!'' کرتی لیکن وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ پاتا۔ البتہ اپنے طور پر یہ اندازہ ضرور لگا لیتا کہ چڑیا کا بچّہ بھوکا ہے یا پیاسا۔ اگر اس کے بعد بھی وہ پھر بولنے لگتا تو وہ سمجھ جاتا کہ یہ اب میرا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ اکثر وہ اپنی ممّی سے چڑیوں کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتا۔

گھر میں کاشف، کے ساتھ ساتھ دوسرے بچّوں میں کاوش، فوزیہ، ثمّو، انجم، عافیہ، شعبان اور ننّھی تسنیم جو اسی سال چلنا سیکھی تھی۔ ان سب کے لیے وہ چڑیا کا بچّہ دلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ سب بچّے کاشف سے اس ننّھی چڑیا کے بارے میں عجیب عجیب سے سوالات کرتے۔ کاشف انھیں مطمئن بھی کر پاتا تھا یا نہیں کہنا مشکل ہے۔ بہر حال وہ کوشش ضرور کرتا تھا۔ ان سوالوں کے کئی ایک جواب تو بڑے معقول ہوتے اور کچھ باتوں کو وہ گھما پھرا کر بتلاتا۔ آخر تھا تو وہ بھی بچّہ ہی...

پاپا تو صبح سویرے ہی کام پر نکل جاتے لیکن اس کا دن بھر ممّی سے ہی واسطہ پڑتا۔ انھیں کاشف کے اس شغل سے یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ اسکول سے آنے کے بعد الٹے سیدھے کھیل کھیلتا، اسکول نہ جانے والے شرارتی بچّوں کے ساتھ اِدھر اُدھر نکل جاتا اور شام کو ممّی کی ڈانٹ ڈپٹ

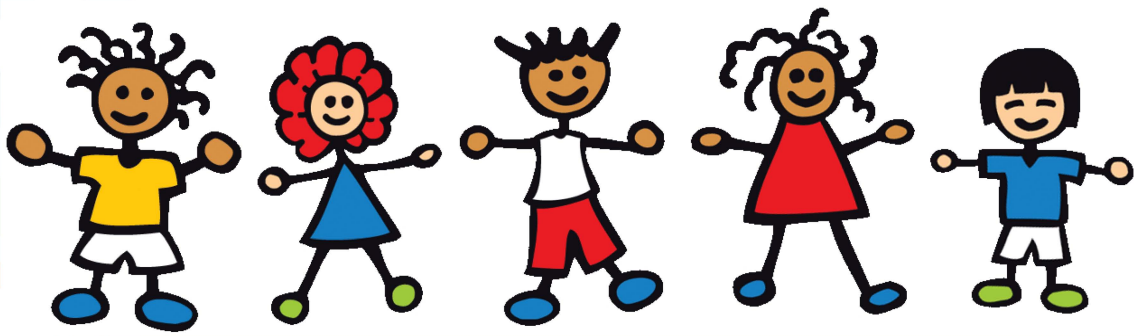

کے بعد ہوم ورک کرنے بیٹھ جاتا۔ دیکھنے والے دل ہی دل میں کہتے بچّہ بڑا پڑھاکو ہے۔

یہ بات بڑوں کے ساتھ ساتھ بچّوں کو بھی معلوم ہوگئی تھی کہ ان کے گھر کے صحن میں کھڑے امرود کے پیڑ پر چڑیا نے گھونسلہ بنالیا ہے۔ اس کی تصدیق میں کاشف، کاوش، فوزیہ اور انجم چھت پر چڑھے۔ آخر کسی نہ کسی طرح انھیں چڑیا کا گھونسلہ دکھائی دے ہی گیا۔

انجم نے انگلی اٹھا کر اشارہ کیا اور بولی Bird of nest۔ اس پر کاشف نے اصلاح کی کہ Bird of nest نہیں Nest of bird کہتے ہیں۔ امرود کا پیڑ خاصا بڑا اور گھن چھت تھا۔ موسم آنے پر اس

میں ڈھیر سارے امرود آتے۔ جو پڑوس تک میں تقسیم کیے جاتے۔ امرود کا پیڑ بڑا اور گھنا تھا اس وجہ سے بچّوں کی پہنچ سے باہر تھا۔ لیکن

وہ دور ہی سے گھونسلے کا نظارہ کر سکتے تھے۔ ادھر گھر کے بڑوں کی یہ سخت تاکید تھی کہ کوئی بچّہ پیڑ پر نہ چڑھے۔ گھونسلہ دیکھنے کے بعد بچّے آپس میں اپنی نالج کا رعب جماتے۔ کاشف نے دوسرے بچّوں پر اپنے دادا کے انداز میں رعب جمایا: ''پہلے چڑیا اور چڑا دونوں مل کر کسی ایسے پیڑ پر گھونسلہ بناتے ہیں جو صرف ان کے لیے نہیں بلکہ ان کے انڈوں اور بچّوں کے لیے بھی محفوظ ہو، تیز ہوائیں بھی ان کے گھونسلے کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ ایسی ہی جگہوں پر وہ انڈے دیتے ہیں۔''

شمّو ذہین تھا اس نے فوراً لقمہ دیا'' کاشف! بھائی! یہ ساری باتیں تمھیں کس نے بتائیں؟ ہمیں تو اس بارے میں ذرا بھی معلوم نہیں؟''

کاوش نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ تب کاشف نے انھیں بتایا، دیکھو بھئی! یہ کوئی مشکل بات نہیں بس ذرا دھیان دینے کی ضرورت ہے۔''

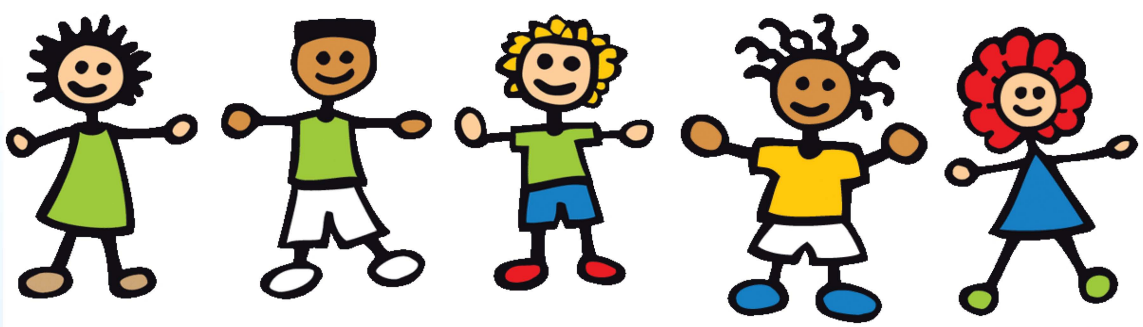

شمّو جو بڑے غور سے یہ باتیں سن رہا تھا اچانک بول اٹھا۔

''بھائی جان! یہ دھیان کسے کہتے ہیں؟''

کاوش نے سمجھایا ''دھیان کہتے ہیں خیال کو، کسی کی بات کو غور سے سننا اور اسے یاد رکھنا کیوں کہ جب جب ہم لوگ اپنے ممّی پاپا یا دادا، دادی سے کوئی کہانی یا واقعہ سنتے ہیں اور اس میں کوئی نئی بات ہمارے سامنے پہلی بار آتی ہے تو ہم اس کا مطلب پوچھتے ہیں۔ بس جانکاری کے بعد وہ بات ہمارے دھیان، ہمارے خیال، ہمارے دماغ میں رہنی چاہیے۔''

پھر کاشف نے شمّو کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ''جیسے ہم اپنا کوئی سبق پڑھ کر اسے اپنے ذہن میں کمپیوٹر کی طرح فیڈ کر لیتے ہیں اور پھر وہی سبق ایک سوال بن کر امتحان کے پرچے میں ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم اسے اپنے دھیان میں یعنی اپنے خیال سے اس کا صحیح جواب لکھ دیتے ہیں۔''

بہر حال، یہ بات چند روز بعد کی ہے۔ اس رات ہوا ذرا کچھ تیز چلی تھی۔ پتہ نہیں کس طرح چڑیا کا بچّہ گھونسلے سے نیچے گر پڑا۔

کاشف نے صبح اٹھتے ہی چڑیا کے بچّے کو دیکھ کر شور مچا دیا۔ اب تو ایک ایک کر کے سبھی بچّے اس کے پاس تھے۔ اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس نے بچّے کو کھڑا کیا کہ کہیں اس کی ٹانگ میں فریکچر تو نہیں ہو گیا۔ اس کے پنکھ کھولے۔ لیکن سب کچھ ٹھیک تھا۔ یکا یک وہ ننھا سا بچّہ کاشف کی ہتھیلی سے پھُر سے اڑ گیا۔ لیکن وہ اس کی پہنچ سے دور نہ تھا۔ اس نے آہستہ سے پھر اسے پکڑ لیا اور کچھ سوچنے لگا۔

اس کے سامنے پلاسٹک کی ڈلیا رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے اٹھایا اور پھر اپنی آرٹ کی بھری ہوئی کاپی کا کور لے کر ڈلیا کو الٹا کر کے پرکار سے جگہ جگہ اس میں سوراخ بنائے اور پلاسٹک کی ڈوری سے اس میں بند

لگا دیے۔ پھر چاقو کی مدد سے اس میں دروازہ بنا لیا۔ اب پنجرہ بن کر تیار ہو گیا تھا۔ بچّوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ کیوں کہ یہ سب کچھ ان کے سامنے ہوا تھا۔ کاشف نے گھڑی دیکھی اور سبھی بچّوں کو اسکول چلنے کے لیے کہا۔ اب اس نے چڑیا کے بچّے کو پنجرہ میں بند کر کے اس میں پانی کے لیے چھوٹی سی کٹوری رکھی اور اس میں پانی بھر دیا۔

کاشف، کاوش، فوزیہ وغیرہ سبھی بچّے اسکول چلے گئے۔ اسکول جاتے ہوئے کاشف نے اپنی ممّی سے کہا۔

''دیکھو جی! میری چڑیا کا خیال رکھنا، کہیں بلّی نہ لے جائے۔ میرا آخری پرچہ ہے آج جلدی آجاؤں گا!''

بچّوں کے اسکول جانے کے بعد ان کی ممّی نے چڑیا کو دانہ پانی دیا اور اس کا پنجرہ بھی بلّی کی نظروں سے بچا کر رکھا۔

پرچہ حل کر کے دوسرے بچّوں کے ساتھ کاشف جب گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا کہ چڑیا کے بچّے کے پنجرے کے چاروں طرف بہت ساری چڑیاں بیٹھی ہوئی شور مچا رہی تھیں۔ کاشف نے کچھ سوچا اور آگے بڑھ کر پنجرہ اٹھا لیا، چڑیوں نے اس پر حملہ کر دیا ہاتھوں اور سر پر چونچیں مارنے لگیں کاشف چڑیوں کا یہ اتحاد دیکھ کر گھبرا گیا اور اس نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ دوسرے ہی لمحہ چڑیا کا بچّہ پنجرے سے نکل کر اپنے ماں باپ اور دوسری چڑیوں کے ساتھ اڑ گیا۔ □

♦ شکیل جاوید بازار شفاعت پوتہ، امروہہ، اتر پردیش

□ مہ ناز بانو

کہانی ٹوٹو کی

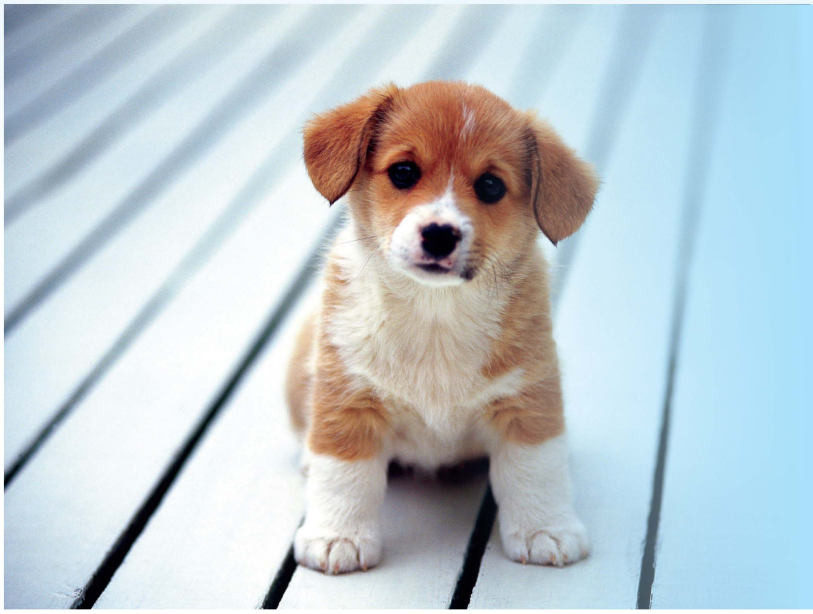

دیپ اپنے والدین اور دادا جی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ہر وقت کھیلتا رہتا تھا اور خوش رہتا تھا۔ وہ شام کو اپنے پیارے کتے 'ٹوٹو' کے ساتھ قریب ہی ایک پارک میں کھیلنے چلا جاتا تھا۔ اگست کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اب بچے پارک میں نہیں کھیلتے تھے۔ بلکہ وہ اب اپنے چھتوں پر پتنگ اڑانے کا مزہ لیتے تھے۔ دیپ بھی اپنے ٹوٹو کے ساتھ اپنی چھت پر پتنگ اڑانے جانے لگا۔ دیپ ہمیشہ سنہرے رنگ کی ہی پتنگ اڑاتا تھا۔ الگ قسم کا رنگ ہونے کی وجہ سے لوگ دور سے ہی دیپ کی پتنگ کو پہچان لیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ٹوٹو اس کھیل سے بور ہونے لگا۔ اسے پارک میں ہی کھیلنا اچھا لگتا تھا۔ ٹوٹو نے سوچا کہ دیپ اب اس کے بارے میں سوچتا ہی نہیں۔ اس سے ٹوٹو اداس رہنے لگا۔ ایک دن دیپ کی ماں دروازہ بند کیے بغیر بازار چلی گئی۔ ٹوٹو نے محسوس کیا پارک میں جا کر کھیلنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ وہ چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا۔ لیکن اسے پارک میں جانے کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ اسی وقت اسے دیپ کا دوست شیام نظر آیا، جو پارک ہی کی طرف جا رہا تھا۔ ٹوٹو خاموشی سے اس کے پیچھے چلنے لگا۔ پارک پہنچ کر ٹوٹو بہت خوش ہوا۔ وہ ادھر ادھر اچھل کود کرنے لگا اور پھر اپنے پرانے دوستوں سے بات چیت کرنے لگا۔ اچانک آسمان پر کالے کالے بادل چھانے لگے۔ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے پارک میں موجود لوگ آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھر کی طرف جانے لگے۔ ٹوٹو نے بھی محسوس کیا کہ موسم خراب ہو رہا ہے۔ اب گھر چلنا

چاہئے۔ وہ پارک سے نکلا۔ لیکن اسے تو گھر کا پتہ معلوم ہی نہیں تھا۔ بارش کے خوف سے آس پاس سناٹا ہو چکا تھا۔ وہ بری طرح گھبرا گیا۔ بارش بھی شروع ہوگئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے سڑک پر چلنے لگا۔ ادھر دیپ جب چھت سے نیچے اترا تو سوچا کہ کیوں نہ کچھ دیر ٹوٹو کے ساتھ ہی کھیلا جائے۔ جب گھر میں کہیں بھی ٹوٹو نظر نہیں آیا تو دیپ پریشان ہوگیا۔ گھر کے تمام لوگ بھی ٹوٹو کے غائب ہوجانے سے پریشان تھے۔ جب بارش بند ہوئی تو تمام لوگ گھر سے باہر آئے اور زور زور سے 'ٹوٹو، ٹوٹو' چلانے لگے۔ گھر کے لوگوں نے پارک، بازار، بیڈمنٹن گراؤنڈ، سبھی جگہ ٹوٹو کو تلاش کیا۔ لیکن ٹوٹو کا کہیں بھی اتہ پتہ نہیں تھا۔ دیپ بہت اداس ہوگیا۔ گھر آ کر سبھی سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔

تبھی دادا جی نے کہا ''میرے دماغ میں ایک خیال آیا ہے۔'' پھر انہوں نے سبھی کو اپنا خیال بتایا۔ سبھی لوگوں کو دادا جی کی ترکیب پسند آئی۔ وہ سب یہ چاہتے تھے اس ترکیب میں کامیابی ملے۔ دیپ اپنی ماں کے ساتھ بازار گیا۔ بازار سے ایک سنہرے رنگ کی پتنگ خرید لایا۔ پتنگ اڑانے والے دھاگے میں چمکنے والے کاغذ کو چپکا دیا۔ اس کے بعد دیپ چھت پر چلا گیا۔ پیچھے پیچھے گھر کے دیگر افراد بھی چھت پر پہنچ گئے۔ دیپ نے چھت پر پتنگ اڑانا شروع کردی۔ آسمان میں سنہری پتنگ چمک اٹھی۔ ادھر ٹوٹو ایک ٹیبل کے نیچے بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی نظر آسمانی پر اڑتی چمک دار پتنگ پر پڑی۔ وہ خوشی سے رو پڑا۔ کیوں کہ اسے معلوم تھا یہ پتنگ اس کے دوست دیپ کی ہے۔ اس نے دھاگے سے چپکے رنگین کاغذ بھی دیکھے۔ وہ رنگین کاغذ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ وہ سوسائٹی، پارک اور سڑکوں کو پار کرتے ہوئے آخر کار اپنے گھر کے پاس پہنچ ہی گیا۔

''بھوں بھوں!'' وہ زور سے چلایا۔

ٹوٹو کی آواز سنتے ہی سبھی چھت سے نیچے بھاگے۔ گھر کا دروازہ کھولتے ہی دیپ ٹوٹو سے بری طرح لپٹ گیا۔ اس نے ٹوٹو سے وعدہ کیا کہ اب وہ کبھی ٹوٹو کو نہیں بھولے گا۔ گھر کے سبھی لوگ بہت خوش تھے۔

اس دن کے بعد سے دیپ اور ٹوٹو کی دوستی اور بھی گہری ہوگئی۔ اب دیپ اور ٹوٹو روزانہ پارک جاتے اور خوب کھیلتے۔ □

♦ مہ ناز کاشانہ علیمی، بی ایل نمبر 4 ایچ/او 5 کانکی ناڑا نارتھ 24 پرگنہ ساؤتھ 743126 مغربی بنگال

□ پیشکش: محمد حسین

بہادری کا سکّہ

چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک دیس ہے جس کا نام جاپان ہے۔ یہ ہمارے ہندوستان سے بہت دور پورب میں واقع ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے محنتی اور وطن پرست ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ماہر کھلاڑی اور بہادر بھی ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا دیس ہونے کی وجہ سے اسے آئے دن بہت سے حملوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

کافی وقت گزرا، سب سے پڑوسی ملک کوریا نے جاپان پر اچانک حملہ کر دیا۔ حملہ بڑا زبردست تھا۔ کوریائی فوجیوں کی تعداد جاپانی فوجیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ جاپانی اس جنگ کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ اس لیے انھیں بلا کسی جنگی تیاری کے ہی جنگ لڑنی پڑی تھی۔ جاپانی سپہ سالار نوبونا گا فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے پاس دشمن کی فوج کے دسویں حصے کے برابر بھی فوجی نہیں تھے اس لیے اس کے فوجیوں کو ذرا بھی یقین نہ تھا کہ وہ اس جنگ میں فتح یاب بھی ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب جنگ کے لیے دل سے تیار نہ تھے۔ نوبونا گا کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ دل اور دماغ سے تیار ہوئے بغیر کوئی جنگ نہیں جیت سکتا۔ جنگ جیتنے کے لیے سپاہیوں کا حوصلہ بلند ہونا چاہئے۔

سپہ سالار نوبونا گا کو پورا یقین تھا کہ اگر سپاہی دل وجان سے لڑے تو مٹھی بھر سپاہیوں سے بھی جنگ جیتی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنی سرزمین پر جنگ لڑنے کا فائدہ تو انھیں ملتا ہی۔ انھوں نے

مخبر بھیج کر دشمن کی کمزوریوں کا پتا بھی لگالیا تھا۔

نوبونا گا نے حکم دیا تو جاپانی فوج کوچ تو کر گئی لیکن سبھی سپاہی فکرمند تھے کہ اس جنگ میں فتح حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ سپہ سالار اپنے سپاہیوں کا یہ حال دیکھ کر بڑا دکھی تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال گردش کررہا تھا کہ سپاہیوں کے دلوں میں جنگ کا ولولہ کس طرح بیدار کیا جائے؟

خوش قسمتی سے میدان جنگ کو جانے والے راستے میں ایک عبادت گاہ تھی۔ نوبونا گا اس جگہ رک گیا اور اپنی فوج کو بھی وہیں رکنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا ''بہادر ساتھیو! میں اس عبادت گاہ میں آپ سب کی فتح یابی اور جنگ سے صحیح سلامت واپسی کے لیے دعا کرنے جارہا ہوں۔ بعد دعا کے میں وہاں پیش کیے گئے اپنے سکوں میں سے ایک سکہ اچھالوں گا، اگر سکہ چہرے کے رخ گرا تو ہماری فتح ہوگی اگر پشت اوپر آئی تو ہم ہار جائیں گے۔''

نوبونا گا

نوبونا گا معبد میں داخل ہوگیا۔ باقی سپاہ باہر رک کر دعا کرنے لگے۔ تقریباً 5 منٹ کے بعد وہ معبد سے باہر آیا اور چبوترے پر چڑھ کر ایک سکہ اچھال دیا۔ سکہ زمین پر سیدھا گرا۔ سکہ کو زمین پر چہرے head کی جانب گرا دیکھ کر سپاہیوں میں جوش و خروش کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی۔ سپہ سالار دل ہی دل میں خوش ہوا اور فوج کو خوشی خوشی میدان جنگ میں اترنے کا حکم دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ مٹھی بھر ہونے کے باوجود جاپانی فوجی کوریائی سپاہیوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے اور شام ہوتے ہوتے جنگ ختم ہوگئی۔ جنگ کے خاتمے پر وہ فوجی جو جنگ شروع ہونے سے قبل سب سے زیادہ مایوس تھا، سپہ سالار کے پاس آیا اور بولا ''عظیم سپہ سالار! سکے کی کرامات نے تو ہماری قسمت ہی بدل دی اس لیے ہم لوگ سچ مچ مٹھی بھر ہونے کے باوجود جنگ جیت گئے۔

نوبونا گا پُر جوش آواز میں بولا ''سکے کی کرامت! کیسی کرامت! ہم نے تو یہ جنگ اپنی طاقت کے بل پر جیتی ہے۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا! اگر آدمی ہمّت کرے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ سکے وکے میں کوئی کرامات نہیں۔ اس کے فیصلے سے تو بالکل ہی جیت نہیں ہوئی۔'' اتنا کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے وہ سکہ نکالا اور اس فوجی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ سپاہی نے جب اس سکے کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو حیرت زدہ ہوگیا۔ اس سکے کے دونوں جانب بادشاہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ □

♦ محمد حسین محلّہ چھاؤنی امام باڑہ بہرائچ یوپی۔ 271801

فرقان احمد سمیر احمد

چار دوست

یہ اچھی سی کہانی ہمیں فرقان احمد سمیر احمدنے سروے نمبر 29/2، پلاٹ نمبر 16، اندراگارڈن، آگرہ روڈ مالی گاؤں (مہاراشٹر) سے ننھے فنکار کالم کے لیے بھیجی ہے۔ اب نہ تو انھوں نے یہ لکھا ہے کہ کہانی دونوں نے مل کر لکھی ہے یا یہ کہ کہیں سے نقل کی ہے۔ تصویر بھی انھوں نے نہیں بھیجی۔ کہانی چونکہ اچھی ہے اس لیے ہم شامل کررہے ہیں۔اگر یہ کہانی آپ نے ہی لکھی ہے تو جلدی سے اپنی تصویربھیجیے تاکہ ہم آئندہ شمارے میں شامل کر سکیں۔

ایک جنگل میں چار دوست شیر، چیتا، بھیڑیا اور لومڑی ایک ساتھ رہتے تھے۔ وہ چاروں آپس میں بہت گہرے دوست تھے۔ ایک ساتھ شکار کرکے کھاتے تھے اور ایک ساتھ ہی ندی پر پانی پینے بھی جاتے تھے۔ ایک دن چاروں دوست شکار پر نکلے۔ پورا جنگل چھان مارا لیکن انھیں کوئی بھی شکار نہیں ملا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ اب تو چاروں بہت ہی پریشان ہوئے۔ چوتھے دن سورج نکلنے پر چیتے نے کہا کہ میں کسی اونچے درخت پر چڑھ کر دیکھتا ہوں۔ شاید کوئی شکار نظر آجائے۔ درخت پر چڑھنے کے بعد اسے تالاب کے کنارے ایک نیل گائے نظر آئی۔ اس نے لومڑی سے کہا کہ تم نیل گائے کو بہلا پھسلا کر جنگل کے اندر کی طرف لے آؤ۔ پھر ہم چاروں مل کر اس کا شکار کرلیں گے۔ لومڑی نے کہا اچھا ایک کام کرو۔ تم تینوں الگ الگ جگہوں پر چھپ جاؤ میں تھوڑی دیر میں نیل گائے کو بہلا پھسلا کر لے کر آتی ہوں۔ لومڑی تو مکار اور چالاک ہوتی ہی ہے۔ نیل گائے کے قریب

پہنچنے کے بعد اس نے بڑی مٹھاس سے نیل گائے کو مخاطب کر کے کہا ''نیلو بہن! تم یہاں پر سوکھی گھاس کیوں کھا رہی ہو؟ یہاں سے اچھی اور نرم گھاس تو اندر جنگل میں ہے۔ یہاں پر تالاب کا پانی بھی بہت گندہ ہے۔ میری مانو تو میرے ساتھ جنگل کے اندر چلو اور نرم نرم گھاس کھاؤ اور وہاں کے تالاب کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی بھی پیو۔''

نیل گائے لومڑی کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی اور بڑی بے قراری سے پوچھا ''ارے بہن! وہ جگہ ہے کہاں؟ مجھے جلدی سے بتاؤ۔''

لومڑی دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی اور نیل گائے کو لے کر جنگل میں چلی۔ کچھ دیر بعد وہ نیل گائے کو اس جگہ لے کر آئی جہاں پہلے ہی شیر، چیتا اور بھیڑیا چھپے ہوئے تھے۔ جوں ہی نیل گائے قریب پہنچی، تینوں ایک ساتھ اس پر حملہ آور ہوئے اور اسے ہلاک کر دیا۔ نیل گائے کو مارنے کے بعد شیر نے کہا ''میں جنگل کا راجہ ہوں اس لیے میں پہلے اسے کھاؤں گا۔''

یہ سن کر چیتے نے کہا ''ارے میں نے ہی تو درخت پر چڑھ کر اسے دیکھا تھا۔ اس لئے پہلے میں کھاؤں گا۔''

تب بھیڑیئے نے کہا ''سب سے پہلے میں نے اس پر حملہ کیا تھا اس لئے پہلے میرا حق بنتا ہے۔''

تینوں کی باتیں سن کر لومڑی نے کہا ''ارے بے وقوفو! میں اپنی چالاکی سے نیل گائے کو بہلا پھسلا کر یہاں لائی تھی۔ اس لئے میں پہلے کھاؤں گی۔'' اس طرح پہلے کھانے کے لیے چاروں میں جھگڑا ہونے لگا۔

چاروں کا جھگڑا جاری تھا کہ اتنے میں ایک گیدڑ وہاں سے گذرا۔ اس نے ان چاروں کو اس طرح جھگڑا کرتے دیکھا تو ان کے قریب آیا اور ان سے جھگڑے کی وجہ پوچھی۔ چاروں نے ایک ایک کر کے اپنی روداد سنائی۔ گیدڑ کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا پھر بولا۔ ''میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی ہے جس سے سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔''

چاروں نے بے صبری سے پوچھا کون سی ترکیب؟ تب گیدڑ نے کہا ''تم چاروں تالاب پر جا کر منہ ہاتھ دھو آؤ، تب تک میں شکار کے

چار برابر برابر حصے کر دیتا ہوں۔ کسی کو کوئی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' چاروں کو یہ بات پسند آئی اور وہ تالاب کی طرف روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد گیدڑ نیل گائے کو گھسیٹتا ہوا وہاں سے فرار ہو گیا۔ جب چاروں واپس آئے تو وہاں پر نہ تو نیل گائے تھی نہ ہی گیدڑ۔ چاروں بہت پچھتائے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ □

ادارہ

مارچ شمسی سال کے جولین اور گریگورین دونوں کیلینڈروں کا تیسرا مہینہ ہے اور یہ سال کے 31 دنوں والے سات مہینوں میں سے ایک ہے۔ زمین کے اُس آدھے گولے میں جو شمال میں ہے، مارچ سے Spring کے موسم کی شروعات ہوتی ہے جسے ہمارے یہاں بسنت یا بہار کا موسم کہتے ہیں۔ یہ شروعات 20 یا 21 مارچ سے مانی جاتی ہے۔ لیکن زمین کے جنوبی گولے کے ملکوں میں یہ درختوں کے پرانے پتوں کے جھڑنے اور نئے پتّوں کا موسم ہوتا ہے جسے پت جھڑ یا خزاں کا موسم Autumn کہتے ہیں۔ مارچ اسی دن شروع ہوتا ہے جو نومبر کا پہلا دن ہو۔ لوند کا سال یعنی leap year نہ ہو تو فروری کا پہلا دن بھی اسی دن سے شروع ہوتا ہے۔ لوند کے سال میں مارچ کا آخری دن وہی ہوتا ہے جو اپریل یا دسمبر کا آخری دن ہو۔

لفظ مارچ لاطینی لفظ Martius سے آیا ہے۔ اور یہ لفظ مارس Mars سے آیا جو رومنوں کے جنگ کے دیوتا کا نام ہے اور جسے زراعت کا سرپرست بھی مانا جاتا تھا۔ رومن خود کو اسی دیوتا کی اولاد مانتے تھے جس کے دو بیٹوں

رومنوں کا جنگ کا دیوتا

رومولس Romulus اور ریمس Remus کی نسل سے ان کے آباو اجداد پیدا ہوئے تھے۔ اسی لیے رومن کیلینڈر میں یہ سال کا پہلا مہینہ ہوتا تھا اور اسی حساب

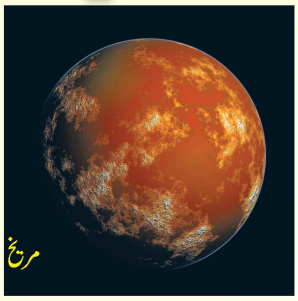
مریخ

سے ستمبر ساتواں، اکتوبر آٹھواں، نومبر نو واں اور دسمبر دسواں مہینہ ہوا کرتا تھا جن کے بارے میں آپ پچھلے شماروں میں پڑھ آئے ہیں۔ موسموں کے لحاظ سے اس مہینے میں نئی فصلوں کی شروعات ہوتی تھی اور برفیلے موسم کے ختم ہونے پر پہلی بار زمین دکھائی دیتی تھی۔ ان سبھی وجہوں سے اس مہینے میں جشن کا ماحول رہتا تھا اور روم میں بھی خوب خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ بہت سی تہذیبوں کے پرانے سال بھی اسی مہینے کے دنوں میں شروع ہوا کرتے تھے۔ رومنوں نے شمسی نظام کے چوتھے سیارے مریخ کا نام بھی اپنے جنگ کے دیوتا کے نام پر Mars رکھ دیا تھا کیونکہ اس کا رنگ آئرن آکسائڈ کی وجہ سے سرخ ہوتا ہے اور سرخی خون یا جنگ کی نشانی ہے۔ اب ہم اس مہینے کے اہم تاریخی واقعات کا رخ کرتے ہیں۔

یکم مارچ: 1961 امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے امن دستہ Peace Corps بنایا تاکہ اس کے رضا کار نوجوان امریکی دنیا کے ترقی پذیر ملکوں میں جا کر وہاں صحت، تعلیم اور بنیادی انسانی ضرورتوں کے سلسلے میں لوگوں کی مدد کریں۔

2 مارچ: 1791 کو پیرس میں تیزی سے پیغام پہنچانے والی سیما فور مشین کا استعمال شروع ہوا۔ یہ مشین ایک بلند مینار کے اوپر مختلف اشاراتی نشان بلند کر دیتی تھی جنھیں دیکھ کر کافی فاصلے پر کھڑے بلند مینار پر کھڑا شخص نوٹ کرتا جاتا تھا اور انھیں اپنے مینار پر ویسی ہی مشین

سیما فور مشین سے پیغام پہنچانے کے منظر کی پینٹنگ

کے ذریعے بلند کر دیتا تھا تا کہ اگلے مینار پر کھڑا شخص انھیں دیکھ کر پیغام کو سمجھ لے اور اسے اگلے مینار پر کھڑے شخص کو دکھا دے۔ اس طرح سلسلہ وار میناروں کے ذریعہ پیغام بہت دور تک چند منٹوں میں پہنچ جاتا تھا۔ بعد میں ٹیلی گراف نے اس کی جگہ لے لی۔

3 مارچ: 78 کو ہندوستانی کیلینڈر 'شک سمبت' کی شروعات ہوئی۔ کہتے ہیں یہ کشانوں کے عہد میں شروع ہوا اور اس وقت راجہ کنشک کی حکومت تھی۔ اسے ہندو کیلینڈر بھی کہتے ہیں اور یہ ہندوستان کے علاوہ کمبوڈیا، جاوا اور جزیرۂ بالی میں بھی رائج ہے۔ ہندوستان میں اسے 1957 میں قومی کیلینڈر کے طور پر اپنایا گیا۔ ♦ 1939 میں اس دن مہاتما گاندھی نے ممبئی میں انگریزوں کی حکومت کے خلاف احتجاج میں بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ♦ 1707 میں اورنگ زیب کا 88 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ♦

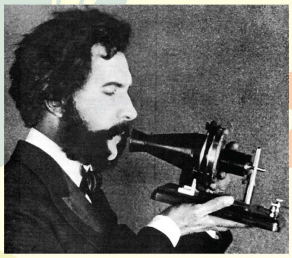

1847 میں اس روز ٹیلی فون کے موجد الیگزینڈر گراہم بیل کی ایڈنبرا، اسکاٹ لینڈ انگلینڈ میں پیدائش ہوئی۔ 10 مارچ 1876 کو اس نے ٹیلیفون کی ایجاد مکمل ہونے پر جو پہلا جملہ ٹیلی فون پر اپنے اسسٹنٹ کو مخاطب کرتے وقت ادا کیا تھا وہ تھا: "Mister Watson, come here, I want you." مسٹر واٹسن، یہاں آیئے، مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ یہ ٹیلی فون پر ادا ہونے والا دنیا کی تاریخ کا پہلا جملہ تھا۔

4 مارچ: 1193 کو مصر، عراق، حجاز اور یمن کے مسلم حکمراں سلطان صلاح الدین ایوبی کا انتقال ہو گیا۔ وہ بے حد عقل مند اور بہادر حکمراں تھا۔

5 مارچ: 1351 کو دہلی کے سلطان محمد بن تغلق نے انتقال کیا۔ تاریخ میں اسے ایک احمق اور غیر دور اندیش حکمراں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر وقت حکومتی نظام کو بہتر بنانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔

محمد بن تغلق

6 مارچ: 1475 کو مغرب کا مشہور مجسمہ ساز، مصور، آرکیٹکٹ اور شاعر مائیکل

مائیکل اینجلو

اینجلو اٹلی کے قصبے کیپریز میں پیدا ہوا۔

7مارچ:2009 کو امریکی خلائی ایجنسی ناسا نے خلائی دوربین 'کیپلر اسپیس آبزرویٹری' کو خلا میں بھیجا تاکہ کائنات میں زمین جیسے کسی دوسرے سیارے کی موجودگی کا پتہ لگایا جاسکے۔

8مارچ: 1930 کو مہاتما گاندھی نے شہری نافرمانی کی تحریک شروع کی۔

9مارچ:1500 کو پرتگال کا مہم جو پیڈرو اَل واریز کیبرال 13 جہاز لے کر ہندوستان سے تجارت کے لیے اسی سمندری راستے سے روانہ ہوا جسے ہندوستان آنے کے لیے سب سے پہلے پرتگال کے ہی واسکو ڈی گاما نے اختیار کیا تھا۔ یہاں کالی کٹ کے ساحل پر عربوں اور ہندوستانیوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا اور اس کے بیڑے کو کافی جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ مگر کیبرال نے اس کا سخت بدلہ لیا اور شہر میں تباہی پھیلا دی

پیڈرو کیبرال

♦ 1451 کو اٹلی کے شہر فلورنس میں امیرگو ویسپوچی پیدا ہوا۔ اس مہم جو نے پہلی بار جنوبی براعظم امریکہ اور اس کے خاص دریا امیزن Amazon کا پتہ لگایا، جسے اس نے ایک نیا براعظم مانا تھا۔ 1507 میں ایک جرمن نقشہ نویس نے امیرگو کی دریافت کی ہوئی زمین کو نئی زمین کی بجائے امریکہ لکھا تھا اور تبھی سے امیرگو کے نام پر امریکہ کو اپنا نام مل گیا، حالانکہ شمالی امریکہ کی دریافت اس سے پہلے اٹلی کا ہی مہم جو کرسٹوفر کولمبس کر چکا تھا۔

امیرگو ویسپوچی

♦ 1934 میں روس کے شہر ژتسک Gzhatsk میں یوری گگارین کی پیدائش ہوئی جس نے 12 اپریل 1961 کو خلا میں زمین کا چکر لگایا۔ ایسا کرنے والا وہ دنیا کا پہلا انسان تھا۔ یہ کامیابی خلائی سائنس میں سوویت روس کو امریکہ سے بہت آگے لے گئی۔

10مارچ: 1735 کو ایران کے حکمراں نادرشاہ اور روس کی حکومت کے درمیان آذر بائیجان کے شہر گنزہ میں میں صلح کا معاہدہ ہوا جس کے بعد روسی فوجیں شہر سے واپس چلی گئیں۔

11مارچ :1795 کو مرہٹوں نے نظام دکن کی فوج کو کردلہ کی لڑائی میں ہرادیا۔ نظام سلطان اپنے ساتھ اپنی بیویوں کو بھی لے گیا۔ مگر اس کی بیویاں توپوں کی گرج سے دہشت زدہ ہونے لگیں۔ تب نظام کے حکم پر اسے اور اس کی بیویوں کو توپوں کی گرج سے دور لے جایا گیا جس سے اس کی اپنی ہی فوج میں غلط فہمی پھیل گئی♦ 1963 میں ہندوستانی کرکٹ کھلاڑی اور فاسٹ بولر محمد نثار کا انتقال ہوگیا جنھوں

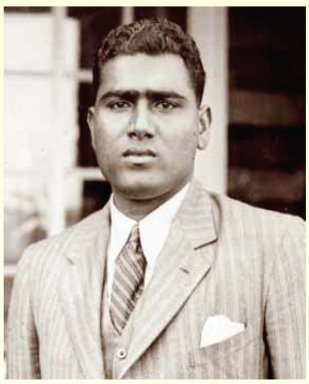

نے 1932 اور 1936 کے دوران کل چھ ٹیسٹ میچوں میں 25 وکٹ لیے تھے۔ ♦ 1918 میں ہسپانوی انفلو انزا Spanish Influenza پہلی بار امریکہ پہنچا اور کنساس کے فورٹ ریلے شہر میں 107 سپاہی بیمار پڑ گئے۔ بعد میں وائرس سے پھیلنے والی اس بیماری نے امریکہ کی ایک چوتھائی آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور 50 لاکھ لوگوں کی موت ہوگئی۔ یہاں سے یہ بیماری دنیا کے کئی ملکوں میں پہنچی اور 1920 کے پورے ہونے تک دنیا بھر میں کل ملا کر 2 کروڑ 20 لاکھ لوگ اس کی وجہ سے موت کے منھ میں پہنچ گئے۔ ♦ 1918 میں برطانوی وزیر اعظم اور دانش ور ہیرلڈ ولسن، یارک شائر انگلینڈ میں پیدا ہوئے۔ جب وہ بہت چھوٹے تھے تو انھوں نے برطانوی وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ، 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ، لندن کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی فوٹو کھنچوائی تھی اور 40 سال بعد انگلینڈ کی لیبر پارٹی کی حکومت کا وزیر اعظم بننے پر یہی جگہ ان کی رہائش گاہ بن گئی۔ وہ برطانوی لیبر پارٹی کے لیڈر تھے اور پہلے 1964 سے 1970 تک اور پھر 1974 سے 1976 تک برطانیہ کے وزیر اعظم رہے۔

12 مارچ: 1888 کو امریکہ کے شمال مشرقی علاقوں میں زبردست برفانی طوفان آیا جسے آج بھی The Great Blizzard of 88 کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ 36 گھنٹوں تک جاری رہنے والے اس طوفان سے نیویارک شہر میں 40 انچ موٹی تہہ جم گئی اور تقریباً 400

امریکہ کے ہولناک برفانی طوفان کے بعد کی اصل فوٹو

لوگ مارے گئے۔ ♦ 1994 میں اس روز چرچ آف انگلینڈ نے پہلی بار 32 عورتوں کو پادری کا درجہ دے دیا جس کی مخالفت میں 700 مرد پادریوں نے چرچ آف انگلینڈ کو چھوڑ کر رومن کیتھولک چرچ سے رشتہ قائم کر لیا جو عورتوں کو پادری بننے کی اجازت نہیں دیتا۔ ♦ 1881 میں اسی دن جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک یونان کے شہر سلونیکا میں پیدا ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر انھوں نے ترکی کے انقلاب کی رہنمائی کی اور اس ملک کے پہلے صدر بنے۔

کمال اتاترک

13 مارچ: 1733 کو عیسائی مذہبی راہب اور سائنس داں جوزف پریسٹلی یارک شائر انگلینڈ میں پیدا ہوئے۔ انھوں آکسیجن کی دریافت کی اور وحدانیت یعنی خدا کے واحد یا ایک ہونے کے مذہبی نظریے کو آگے بڑھایا۔ جبکہ عام عیسائی تثلیث Trinity میں یعنی خدا، خدا کے بیٹے اور مقدس روح میں یقین رکھتے ہیں۔

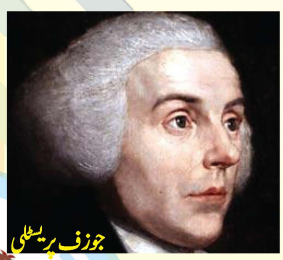

جوزف پریسٹلی

14 مارچ: 1879 کو ایم Ulm جرمنی میں مشہور سائنس

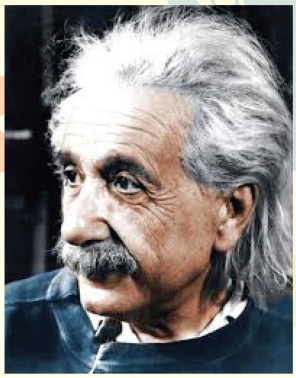

داں البرٹ آئنسٹائن کی پیدائش ہوئی۔ان کے نظریۂ اضافیت theory of relativity نے وقت ، خلا، مادہ اورتوانائی time, space, matter and energy کے بارے میں دنیا کی سوچ کو بدل کر رکھ دیا۔ 1921 میں انھیں نوبیل پرائز دیا گیا اور 1933 میں انھیں نازی جرمنی کی نکتہ چینی کرنے کی وجہ سے جرمنی کو چھوڑ کر امریکہ میں پناہ لے لی۔انھوں نے اس وقت کے امریکی صدر روز ویلٹ کوخبردار کیا کہ ان کے یقین کے مطابق نازی جرمنی ایٹم بم تیار کرنے کی کوشش میں لگا ہے،اس لیے امریکہ کو پہلے ہی ایٹم بم بنالینا چاہیئے۔ امریکہ نے ایسا ہی کیا اور یوں آئنسٹائن اپنی کوتاہ اندیشی یا حماقت کی وجہ سے ایک ایسے تباہ کن ہتھیار کی ایجاد کا سبب بن گئے جس کا پہلا اوراب تک کا واحد استعمال امریکہ نے جاپان میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر دوایٹم بم گرا کر کیا اور دس لاکھ سے زیادہ لوگ مر گئے۔

15 مارچ: حضرت عیسیٰ سے 44 سال قبل کو روم کے شہنشاہ جولیس سیزر کو بروٹس اوراس کے ساتھیوں نے سینیٹ چیمبر یعنی ایوانِ نمائندگان میں قتل کر دیا۔ پہلے تو سیزر نے خود کو بچانے کی کوشش کی لیکن جب اس نے حملہ آوروں میں اپنے دوست بروٹس کو بھی شامل دیکھا تو حیرت

کے عالم میں بے ساختہ اس کے منھ سے تاریخی جملہ ادا ہوا، "Et tu, Brute?"(تم بھی، بروٹس؟)اوراپنے بچاؤ کی کوشش چھوڑ دی جس کے بعد اسے چاقو مار مار کرختم کر دیا گیا۔شیکسپیئر کے لکھے ڈرامے 'جولیس سیزر' میں نقل کئے گئے اس جملے نے لفظ Brute کو بے رحمی کا ہم معنی بنا دیا اور یہ جملہ اپنے آپ میں بے وفائی اور سازش کا محاورہ بن گیا۔♦ 1767 میں ساؤتھ کیرولینا کے واکشا میں ایک کیبن میں اینڈریو جیکسن کی پیدائش ہوئی جو امریکہ کا ساتواں لیکن بہت غریب

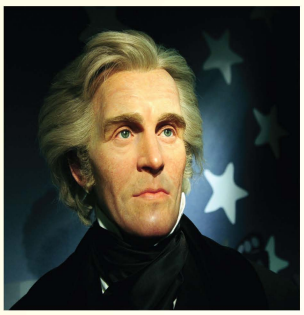

خاندان سے تعلق رکھنے والا پہلا صدر بنا۔ وہ چھوٹی عمر میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں جسے امریکی انقلاب کی جنگ کہا جاتا ہے،شامل ہوگیا تھا۔ ایک بار انگریزوں کی قید میں اسے ایک انگریز افسر کے بوٹ صاف کرنے کو کہا گیا تو اس نے انکار کر دیا جس پر افسر نے اسے تلوار سے زخمی کر دیا۔1812 کی جنگ میں وہ ایک ہیرو کی طرح مشہور ہوگیا۔سیاست میں آنے پر اس نے نئی ڈیموکریٹک پارٹی قائم کی 1829 سے 1837 تک امریکہ کا صدر رہا۔♦ 1946 میں برطانوی وزیراعظم ایٹلی نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ہندوستان کوآزادی کا حق ہے۔

16 مارچ: 1968 کو ویت نام کے مائی لائی گاؤں میں امریکی فوجیوں کی ایک کمپنی نے جس کا نام چارلی تھا قتل عام کر کے 504 ویت نامی مرد عورتوں اور بچوں کی جان لے لی۔ بعد میں 25 فوجی افسروں کو اس قتل عام سے جڑا ہونے کا قصوروار پایا گیا مگر صرف ایک کو قید کی سزا ہوئی اوراسے بھی امریکی صدر رچرڈ نکسن نے معافی دے دی۔

17 مارچ: 624 کو پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی رہنمائی میں مسلمانوں نے جنگ بدر میں کامیابی حاصل کی۔

18 مارچ: 1922 کو مہاتما گاندھی کو سول نافرمانی کے لیے 6 سال قید کی سزا دی، تاہم خوف زدہ انگریز حکومت نے دوسال بعد انھیں رہا کر دیا۔

19مارچ:2003 کوامریکہ نے صدام حسین کی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے عراق کے خلاف جنگ شروع کر دی جس کے بعد صرف 21روز میں عراق کی راجدھانی بغداد پر قبضہ کر لیا گیا۔تین سال امریکہ کی کٹھ پتلی عراقی سرکار نے صدام حسین کو پھانسی پر چڑھا دیا۔

20مارچ:1739 کو نادرشاہ نے دہلی پر قبضہ کر کے قتل عام شروع کرا دیا۔♦ 1977 میں اس روز وزیر اعظم اندرا گاندھی الیکشن ہار گئیں اور دو روز بعد انھوں نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

21مارچ:1685 کو مشہور آرگن نواز اور کمپوزر جان سیبیشین باخ جرمن شہر آئشناچ میں پیدا ہوا۔اس نے ہزاروں دھنیں ترتیب دیں جو چرچوں میں بجائی جاتی تھیں۔ اس کی مشہور تخلیقات میں The Brandenburg Concertos for orchestra, The Well-Tempered Clavier for keyboard, the St. John اور The Mass in B Minor شامل ہیں۔

22مارچ:1957 کو ہندوستان نے گریگورین کیلینڈر کے ساتھ شک Saka سمبت کیلینڈر بھی اپنا لیا۔

23مارچ:1889 کو قادیان پنجاب کے مسلمان مرزا غلام احمد نے احمدیہ فرقے کی بنیاد رکھی جسے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے سخت ناپسند کیا اور کافی بعد میں پاکستان کے الگ ملک بننے کے تقریباً تیس سال بعد وہاں اس فرقے کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔اسے قادیانی فرقہ بھی کہتے ہیں♦ 1940 میں آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے الگ ہوم لینڈ کا مطالبہ شروع کر دیا اور لاہور میں لیگ کے سالانہ کنونشن میں 'قراردادِ پاکستان' منظور کی گئی۔

مرزا غلام احمد

24مارچ:1874 کو مشہور جادوگر ہیری ہوڈینی، ہنگری کے شہر بڈاپسٹ میں پیدا ہوا۔ وہ بچہ تھا جب اس کا خاندان امریکہ کے نیویارک شہر میں آ کر رہنے لگا۔اس نے جادوگری کا فن سیکھا اور ایک زبردست کرتب باز بن گیا۔وہ ہر طرح کی قید سے باہر نکل آتا تھا چاہے اسے زنجیروں میں جکڑا گیا ہو، چاہے کسی صندوق، یا کمرے میں بند ہو۔ یہاں تک کہ وہ دودھ کی بڑی کین کے اندر بند کر دیے جانے پر بھی باہر نکل آتا تھا۔

ہوڈنی کے تماشے کا ایک اشتہار◀

25مارچ:1807 کو برطانیہ کی پارلیمنٹ نے انسانوں کو غلام بنا کر ان کی تجارت کرنے کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

26مارچ:1668 کو انگلینڈ نے ہندوستان کے بمبئی علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔پہلے یہ سات جزیروں والا علاقہ پرتگالیوں کے قبضے میں تھا۔♦ 1992 میں سوویت یونین کا خلاباز سرگی کریکالیف خلا میں سوویت خلائی اسٹیشن میر Mir پر 313 دن گزار کر روس واپس آیا۔ اس دوران یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلکس USSR کا خاتمہ ہو چکا تھا اور روس ایک الگ ملک بن گیا تھا۔Mir روسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں امن۔♦ 1911 میں امریکی ڈرامہ نگار ٹینیسی ولیمز کی مسی سپی کے شہر کولمبس میں پیدائش ہوئی۔اس کی تخلیقات میں The Glass Menagerie, Night of the Iguana, A

Cat on a Hot Tin اور Streetcar Named Desire Roof شامل ہیں۔ان کے ڈراموں کو دومرتبہ پلٹزر انعام Pulitzer Prize سے نوازا گیا۔

27مارچ:1668 کو انگلینڈ کے کنگ چارلس دوم نے بمبئی کا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا۔♦1977 میں اس روز شہری فضائی پرواز کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ ہوا جب کناری جزیرے پر دو

بوئنگ 747 جیٹ ہوائی جہاز زمین پر ہی آپس میں ٹکرا کر جل گئے۔ اس حادثے میں 570 لوگوں کی موت ہوئی۔

28مارچ:1556 کو اکبر اعظم کے دور میں فصلی سال کی شروعات ہوئی جو شمسی سال کے مطابق تھی۔اس سے پہلے یہ اسلامی سن ہجری سے مطابقت رکھتا تھا۔فصلی لفظ، عربی لفظ فصل سے آیا ہے۔اکبر کے زمانے سے یہ موسموں سے مطابقت رکھنے لگا اور شمسی کیلینڈر کے ساتھ چلنے لگا۔ یہ جولائی میں شروع اور جون میں ختم ہوتا ہے۔اس کا استعمال زراعت یا کھیتی باڑی سے متعلق معاملوں میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ حیدرآباد دکن کی حکومت میں رائج تھا۔آندھرا پردیش، کرناٹک اور تمل ناڈو کی ریاستوں میں ریونیو اور عدالتی معاملات میں فصلی سال اب تک استعمال ہوتا ہے۔♦1977 میں مرارجی دیسائی نے آزاد ہندوستان کی پہلی غیر کانگریسی حکومت قائم کی۔

29مارچ:1849 کو سکھوں کی ہار کے بعد برطانوی حکومت نے پنجاب کو اپنی عمل داری میں لے لیا اور اس پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج ہو گیا۔

30مارچ:1853 کو مشہور مصور وسینٹ وین گاگ کی ہالینڈ کے شہر گروٹ زنڈر میں پیدائش ہوئی۔ ڈچ پینٹر ریمبرانٹ کے بعد اسے دوسرا سب سے عظیم مصور مانا جاتا ہے۔اپنے دس سال کے کیریئر میں اس نے 800 سے زیادہ آئل پینٹنگز اور 700 ڈرائنگ بنائی تھیں لیکن زندگی میں اس کی صرف ایک تصویر فروخت ہوئی۔1987 میں اس کی مشہور پینٹنگ آئریسیز Irises پانچ کروڑ 39 لاکھ ڈالر میں بکی۔اس وقت تک کی یہ سب سے بڑی قیمت تھی جو کسی تصویر کے لیے ادا کی گئی۔ وین گاگ صرف 37 سال جیا۔ وہ مایوسی کے مرض میں مبتلا تھا اور اسے اکثر دماغی دورے پڑتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے اپنا بایاں کان کاٹ لیا تھا۔آخر 1890 میں اس نے خود کو گولی ماری۔

31مارچ:1732 کو آسٹریا کے شہر روہرو میں فرانز جوزف ہیڈن کی پیدائش ہوئی۔ پیانو بجانے والے اس موسیقار کو مغربی موسیقی کی دنیا میں فادر آف سمفنی کہا جاتا ہے۔ اس نے 107 سمفنیاں Symphonies، 58 پیانو سوناٹا Sonata اور 13 ماس ترتیب دیے تھے۔مشہور موسیقار موزارٹ اس کا دوست اور بیتھوون اس کا شاگرد تھا جس نے خود بھی سمفنی کی موسیقی میں زبردست شہرت حاصل کی۔ □

گلیور
بالشتیوں کی دنیا میں

4

جوناتھن سوئفٹ

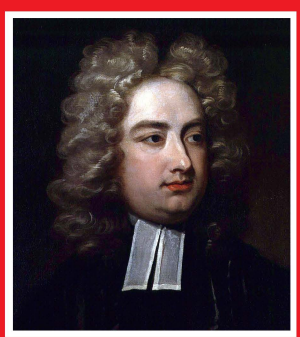

'گلیور بالشتیوں کی دنیا میں' دراصل انگریزی زبان کے کلاسک Gulliver's Travels کا ایک حصہ ہے جسے آئرلینڈ کے عیسائی راہب اور مصنف جوناتھن سوئفٹ نے 1726 میں لکھا تھا۔ یہ انسانی فطرت پر طنز سے بھرپور کہانیوں کا مجموعہ تھا اور بچوں اور بڑوں میں اسے ایک جیسی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس پر کئی فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ انگریزی ادب میں اس تخلیق کی بڑی اہمیت ہے۔

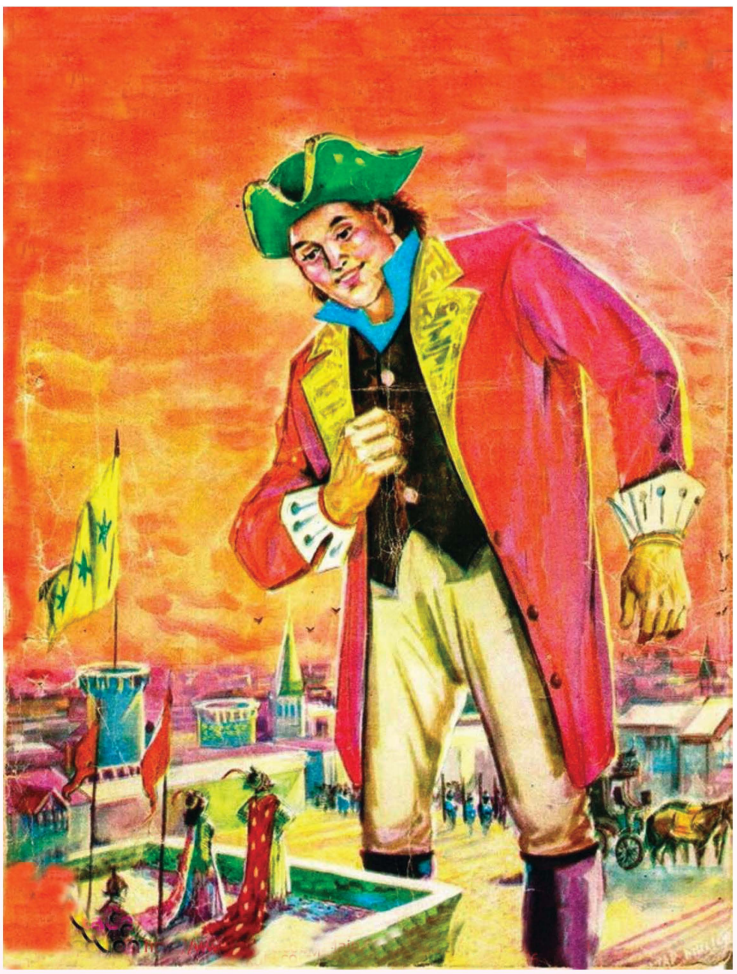

گلیور کھیت میں چھپا ہوا تھا
باپ رے! کتنی اونچی اور موٹی گھاس ہے
ارے، آگے نالا ہے! اب کہاں جاؤں
اب یہ نالا پار بھی نہیں کر سکتا
یہ کیسا ملک ہے؟ اتنا بڑا نالا۔ مجھ سے اونچی گھاس۔ اور دیووں سے بڑے لوگ!
لی پٹ کے باشندوں کو تو میں نے قابو میں کر لیا تھا مگر یہ پہاڑوں جیسے لوگ مجھ سے کیوں ڈریں گے

اے خدا مجھے بچا!
گھاس کے اس جنگل کو
یہ پہاڑ جیسا آدمی
کیسے جلدی
جلدی کاٹے ڈال
رہا ہے
لو، اس
نے مجھے دیکھ
ہی لیا
اوہ!
مر گیا...
تبھی اس دیو نے اپنی زبان میں زور سے آواز لگائی جو ایسی تھی جیسے بادل گرج
رہے ہوں۔ آواز سن کر درانتیاں لیے کئی لوگ ایک شخص کی ماتحتی میں آ گئے
یہ تو وہی آدمی ہے جو
ہمارے جہاز والے ساتھیوں
کے پیچھے دوڑ رہا تھا

ان مزدوروں کا افسر کسان معلوم ہوتا تھا۔اس نے اپنی بھاشا میں کچھ کہا

اس کی زبان گلیور کی سمجھ میں نہیں آئی۔لیکن اس مزدور نے گلیور کو آہستہ سے نیچے ضرور اتار دیا

اس سے گلیور کو کچھ راحت ملی

وہ کسان گلیور کے اشاروں کو سمجھ گیا۔اس نے گلیور کو احتیاط سے رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا

گھر پہنچ کر اس نے گلیور کو آہستہ سے ایک میز پر رکھ دیا

وہ لوگ کھانا کھانے بیٹھے۔ان کے کھانے کے برتن بھی گلیور کے لیے بہت بڑے تھے

کسان کی بیوی نے روٹی کا ایک ٹکڑا اور گوشت چھوٹی طشتری میں گلیور کے آگے رکھ دیا

گلیور کے لیے یہ طشتری بھی کافی بڑی تھی۔ وہ اس کے اندر ہی بیٹھ گیا اور روٹی توڑ کر کھانے لگا

کھانے کے ساتھ دی گئی شراب کا پیالا بھی اتنا بڑا تھا کہ گلیور کو اس کے اندر جھک کر گھونٹ بھرنے پڑے

اچانک گلیور کی نظر کسان کے چھوٹے لڑکے کی گود میں بیٹھی بلّی پر پڑی جو شیر سے بھی تین گنا بڑی تھی۔ گلیور بھاگ کر میز کے دوسرے کونے پر کھڑا ہو گیا

کسان اپنی زبان میں کچھ بڑبڑایا

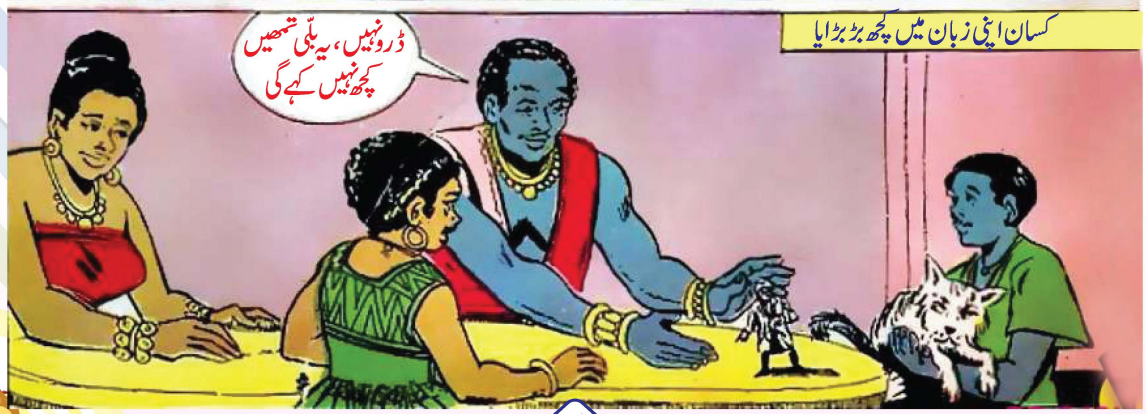

کھانا ختم ہونے پر کسان کھڑا ہو گیا
میں کھیت پر جا رہا ہوں تم اس انسان کی حفاظت کرنا
جی بہت اچھا
اس ننھے آدمی کو اپنے بستر پر سلا دیتی ہوں
لو، میرا رومال اوڑھ لو تمھارے لیے کافی ہے
گلیور گھنٹا بھر ہی سو پایا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گیا
باپ رے! ہیں تو یہ شاید چوہے۔ مگر جنگلی سور سے بھی بڑے لگتے ہیں
اچانک وہ چوہے بستر پر آ گئے۔ ایک تو گلیور کی گردن پر چڑھ گیا۔ گلیور نے فوراً اپنی تلوار نکال لی اور ایک پر زوردار وار کیا
جاری...

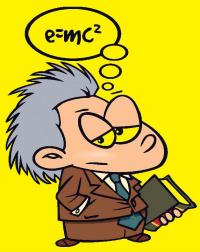

آپ کے سوال
ڈاکٹر بقراط کے جواب

میاں افلاطون: آج پہلا سوال یہ ہے کہ کیا زمین کا آدھا حصہ پانی ہے؟ یہ لکھنؤ سے بلال زبیری نے پوچھا ہے! ویسے میرا خیال ہے پہلے مجھے آپ کو آداب کرنا چاہئے تھا۔ اس لیے آداب عرض ہے ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر بقراط: جیتے رہئے۔ جواب یہ ہے کہ زمین کا آدھا یعنی 50 فیصد حصہ نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ یعنی تقریباً 70 فیصد ہے۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ انسان کے جسم میں بھی 70 فیصد پانی ہوتا ہے باقی اور کچھ۔

افلاطون: پانی؟ لیکن دکھائی تو بالکل نہیں دیتا۔

ڈاکٹر بقراط: دکھائی اس لیے نہیں دیتا کہ پانی دوسری بہت سی چیزوں

میں ملا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً خون اور پیشاب میں زیادہ تر پانی ہی ہے۔ اس کے علاوہ گوشت، ہڈیوں اور رگوں ریشوں میں بھی پانی کی اچھی خاصی مقدار ہوتی ہے۔

افلاطون: بہت خوب۔ اب دہرہ دون کی سائرہ کو یہ بتا دیجیے کہ دنیا سب سے بڑا دریا، دریائے نیل ہے یا امریکہ کی امیزن ندی۔

ڈاکٹر بقراط: بھئی سائرہ صاحبہ یہ دونوں ہی دنیا کے سب سے بڑے دریا ہیں۔ بس ذرا سا فرق ہے۔ افریقہ کا دریائے نیل 6650 لمبا ہے اور جنوبی امریکہ کے امیزن کی لمبائی اس سے صرف ڈھائی سو کلومیٹر کم یعنی 6400 کلومیٹر ہے۔ نیل، افریقہ کے 12 ملکوں سے ہو کر بہتا

ہے۔ یہ ہیں ایتھوپیا (حبش)، اریٹریا، سوڈان، یوگنڈا، تنزانیہ، روآنڈا برونڈی، مصر، ڈیموکریٹک ری پبلک، کانگو، اور جنوبی سوڈان۔ بالآخر یہ بحر اوقیانوس میں جا گرتا ہے۔ امیزن جنوبی افریقہ کے ملکوں برازیل، پیرو، بولیویا، کولمبو، ایکویڈور، وینیز ویلا اور گیانا سے ہو کر بحر اٹلانٹک میں سما جاتا ہے۔ کچھ عرصہ تک شمالی امریکہ کے دریائے مسی سپی کو دنیا کی سب سے طویل ندی مانا جاتا رہا جس کی لمبائی دریائے نیل سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن بعد نئے ضابطوں کے تحت پیائش کی گئی اور اس کا کچھ ابتدائی حصہ چھوڑ دیا گیا تو لمبائی نیل سے کم رہ گئی اور اب دریائے مسی سپی کو 6275 کلومیٹر لمبا مانا جاتا ہے۔ اس دریا کا 98 فی صد حصہ امریکہ یعنی USA سے گزرتا ہے جہاں اس کے نام سے ایک ریاست بھی ہے۔ یہاں سے یہ دریا خلیج میکسیکو میں مل جاتا ہے۔ اس کی ابتدا کناڈا سے ہوتی ہے۔

افلاطون: اچھا یہ بتایئے حاتم طائی کون تھا۔

ہومی واڈیا کی حاتم طائی میں جے راج پرستان میں دعا کرتے ہوئے

ڈاکٹر بقراط: یہ تم جاننا چاہتے ہو؟

افلاطون: نہیں خیر، سوال تو یہ اورنگ آباد سے توفیق علی غوری نے کیا ہے لیکن ایک بات میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر بقراط: اور وہ بات کیا ہے؟

افلاطون: میں نے سنا ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ یا پھر الف لیلہ کے اور بھی کئی کرداروں کی طرح وہ بھی محض ایک خیالی کردار ہے؟

ڈاکٹر بقراط: آپ نے جو کچھ سنا، یا سوچا ہے اس میں کچھ صحیح ہے کچھ غلط ہے۔ اب سنیے۔ طائی یا طے اس عرب قبیلے کا نام ہے جس سے حاتم تعلق رکھتا تھا۔ وہ کوئی بادشاہ وغیرہ نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ دراصل وہ عرب کا ایک مشہور شاعر تھا جس کا پورا نام تھا حاتم بن عبداللہ بن سعد الطائی اور مختصر نام ہے حاتم الطائی جو اردو میں اور بھی مختصر یعنی حاتم طائی ہو گیا ہے۔ حاتم کا زمانہ اسلام کے آنے سے کچھ پہلے کا ہے۔ اپنی بہادری اور سخاوت کی وجہ سے وہ آج بھی عرب میں مشہور ہے۔ عربی زبان میں کسی کی سخاوت و فیاضی بڑھا چڑھا کر بیان کرنی ہو تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص حاتم سے بھی زیادہ سخی ہے۔ اردو میں بھی اسی طرح کہا جاتا ہے۔ اسلام آنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی وہ فوت ہو گیا تھا۔ اس کی بیٹی سفانہ اسلام کے زمانے میں گرفتار ہو کر رسول اکرمؐ کے حضور میں پیش ہوئی تو اس نے اپنے باپ کی سخاوت اور رحم دلی کا تذکرہ کیا۔ رسول اللہ نے اس کو رہا کرنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ حاتم اسلامی اخلاق کا حامل تھا۔ علما کے مطابق بعض حدیثوں میں بھی حاتم کا ذکر ہے۔ شیخ سعدی نے اپنی تصنیف گلستان میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حاتم آج اس دنیا میں نہیں لیکن اس کا نام حشر تک زندہ رہے گا۔ الف لیلہ کی داستان میں حاتم کا ایک فرضی قصہ موجود ہے جس میں وہ ایک بے یارو لاچار شہزادے کی مدد کے لیے ان سات سوالوں کو حل کرنے نکل پڑتا ہے جن کے حل ہونے پر شہزادے کو اپنی مصیبتوں سے نجات مل سکتی ہے۔ کہنے کو یہ سات ہی سوال مشہور ہیں لیکن اکثر سوالوں کو پورا کرنے میں حاتم کو دوسرے کئی لوگوں کے بھی بہت سے سوال پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح یہ کئی درجن سوال ہو جاتے ہیں۔ مگر صرف سات سوال کافی مشہور ہیں۔ پہلا سوال ہے 'ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے'۔ دوسرا ہے: نیکی کر دریا میں ڈال۔ تیسرا: جو کرے گا سو بھرے گا۔ چوتھا: سچے کو ہمیشہ راحت ہے۔ پانچواں: کوہِ ندا کی خبر لا۔ چھٹا: مرغابی کے انڈے برابر موتی لے کر آ۔ ساتواں: حمام باد گرد کی خبر لا۔ اس جادوئی کہانی پر کئی فلمیں بن چکی ہیں جن مجھے ذاتی طور پر سب سے اچھی ہومی واڈیا کی وہ رنگین فلم لگی جو انھوں نے 1956 میں اردو میں بنائی تھی اور جس میں جے راج نے حاتم کا کردار ادا کیا تھا۔ اصل اور حقیقی کردار کی بات کی جائے تو حاتم ایک زبردست شاعر تھا جس کا دیوان پہلی بار رزق اللہ حسون نے لندن سے 1876 میں شائع کیا۔ 1897 میں دیوان کا ترجمہ جرمن زبان میں چھپا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حاتم کے بیٹے عدی بن حاتم نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حاتم الطائی کی موت 578 عیسوی میں ہوئی اور اسے توران میں دفنایا گیا جو موجودہ عرب کے وسط میں ہے۔ الف لیلہ میں اس کے

سعودی عرب کے شمال مغربی شہر حائل کا وہ مقام جس کو حاتم الطائی کی قبر گاہ مانا جاتا ہے ◄

مقبرے کا ذکر ملتا ہے۔اس کی زندگی پر دنیا کی کئی زبانوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔میرا خیال ہے اتنی معلومات تمھارے لیے کافی ہے۔

افلاطون: آپ واقعی پورے بقراط ہیں۔اچھا ہوا آپ نے تفصیل سے بتا دیا،ورنہ سچ یہ ہے کہ میں شروع میں حاتم کو ایک خاتون سمجھتا تھا اور طائی کو ہمیشہ تائی کہا کرتا تھا۔ایک دن میں نے ہسٹری کے ٹیچر سے پوچھا کہ کیوں جناب تاریخ میں کوئی حاتم تایا بھی گزرا ہے کہ نہیں۔یا پھر ہمیں تائی پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔اس کے بعد ٹیچر نے بنچ پر کھڑا کر دیا تو اندازہ ہوا کہ حاتم تائی میں آج بھی کتنی طاقت ہے۔

ڈاکٹر بقراط: گڈ۔تمھاری مذاق کرنے کی حس سنجیدگی کی حس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔اب اگلا سوال ہو جائے۔

افلاطون: یہ بتائیے کہ ناخن کاٹتے وقت درد کیوں نہیں ہوتا۔یہ سوال بھاگل پور سے اسلم پرویز نے پوچھا ہے جو آٹھویں میں پڑھتے ہیں۔

ڈاکٹر بقراط: اس بات کو سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ درد کیا چیز ہے؟دراصل درد ایک ناخوش گوار یا بے چینی پیدا کرنے والا احساس ہوتا ہے جس کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔موٹے طور درد کی دو قسمیں ہیں۔ایک ہے جسمانی درد یا تکلیف اور دوسرا ذہنی یا اعصابی درد ہوتا ہے۔دماغ دونوں طرح کے درد محسوس کرتا ہے۔ذہنی یا اعصابی درد عام طور پر کسی باہری وجہ سے ہوتا ہے اور جسمانی درد اسے کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ کسی تبدیلی یا واقعہ پیش ہونے کے سبب سے پیدا ہوا ہو۔اس کا احساس دماغ کو ان باریک نسوں کے ذریعہ ہوتا ہے جو آدمی کے جسم میں پھیلی ہوئی ہیں۔جسم کے جن حصوں میں یہ نسیں موجود ہیں وہاں کوئی غیر قدرتی واقعہ ہوتا ہے، مثلاً جلنا کٹنا،دبنا،پچکنا وغیرہ تو اس تبدیلی سے جسم کے اس حصے کو جتنی بھی چوٹ پہنچتی ہے اس احساس کو بجلی کی دھڑکنوں یا سگنلز کے طور پر یہ نسیں دماغ تک پہنچا دیتی ہیں اور دماغ درد محسوس کرنے لگتا ہے۔کسی وجہ سے ان نسوں کا دماغ سے رابطہ کٹ جائے یا نسیں کسی کیمیکل اثر کی وجہ سے کام کرنا بند کر دیں تو دماغ کسی طرح کا درد محسوس نہیں کرتا۔جسم کے اکثر بڑے آپریشن یا سرجری اسی لیے ممکن ہیں کہ Anesthesia کے عمل یعنی نسوں یا دماغ کو بے حس کرنے کی دواؤں سے جسمانی احساس کے عمل کو کچھ دیر کے لیے روک دیا جاتا ہے جس کے دوران ہاتھ پاؤں کاٹ دیے بجائیں تب بھی مریض کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ درد پیدا کسی حصے میں ضرور ہوتا ہے لیکن اسے محسوس دماغ ہی کرتا ہے۔جسم کے کئی حصوں میں یہ محسوس کرنے والی نسیں نہیں ہوتیں۔مثلاً ہڈیاں، دانت،بال اور ناخن۔ان پر لگنے والی کسی چوٹ کو دماغ تبھی محسوس کرتا ہے جب وہ گوشت یا نسوں کے قریب کی جگہوں پر پہنچی ہو۔مثلاً،ناخن کے اگلے حصے کو کاٹا جائے تو درد نہیں ہوگا لیکن اگر اس حصے کو کاٹیں جہاں جڑ میں یا کسی ایک طرف گوشت خون اور نسیں موجود ہیں تو آپ درد سے بلبلا اٹھیں گے۔اسی طرح بال کاٹیے تو کچھ نہیں لیکن انھیں جڑ سے اکھاڑیے تو درد ہوتا ہے۔دانت کا درد بھی دانت میں نہیں بلکہ اس کی جڑ یا کھوکھلے حصے میں پیدا ہوتا ہے۔یہی کیفیت ہڈیوں کی ہے۔اس کے علاوہ دل،گردے اور پھیپھڑوں کے کئی حصے ایسے ہیں جہاں محسوس کرنے والی نسیں نہیں ہیں۔چنانچہ ان کی کئی چوٹوں کا بھی دماغ کو پتہ نہیں چلتا۔یہ موٹی سی وجہ ہے ناخن کاٹنے سے تکلیف نہ ہونے کی۔

افلاطون: لیکن میرا خیال ہے ناخن کے کاٹنے سے کافی زیادہ تکلیف ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر بقراط: وہ کیسے؟

افلاطون: وہ ایسے کہ آپ اپنے ناخن سے کسی کو کاٹ لیجیے۔پھر دیکھیے وہ آپ کو کتنی تکلیف پہنچاتا ہے۔

ڈاکٹر بقراط: خوب۔آج کل تمھارا دماغ خوب کام کرنے لگا ہے۔

افلاطون: شکریہ۔ اب ایک سوال اور ہے۔ بلکہ دو سوالوں کا ایک سوال ہے جو قاضی شہاب الدین نے آسنسول سے بھیجا ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ سب سے تھوڑی عمر کس جاندار کی ہوتی اور سب سے لمبی کس کی؟

ڈاکٹر بقراط: پہلے سوال کا جواب قطعیت یعنی Finality کے ساتھ دینا مشکل ہے کیوں کہ کئی ایسے کیڑے یا پتنگے ہیں جو ایک دن یا ایک رات سے لے کر پانچ منٹ تک کے عرصے میں اپنی عمر مکمل کر لیتے ہیں،

جیسے کہ Mayflies یا مئی کے مہینے میں پیدا ہونے والی مکھیاں۔ لیکن لاروا کی شکل میں یہ ایک سال یا اس سے کچھ کم عرصے تک پہلے سے جی رہی ہوتی ہیں۔ مگر لاروا سے مکھی بن کر اڑنے کے بعد بہت کم وقت تک جی پاتی ہیں۔ برسات کے دنوں میں کئی ایسے پتنگے آپ نے دیکھے ہوں گے جو شام کو پیدا ہوتے ہی روشنی کی طرف لپک پڑتے ہیں اور صبح کو مرے ہوئے ملتے ہیں۔ اب رہ گیا سوال کا دوسرا حصہ تو اس کا جواب بھی مشکل ہے۔ عام طور پر کچھوے کی عمر زیادہ مانی جاتی ہے جو ڈھائی سو سال تک ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک طرح کے گھونگے Ocean quahog کی عمر چار سو سال سے زیادہ ناپی گئی ہے۔ اگر درختوں کو بھی شامل کر لیں کیونکہ وہ بھی جاندار ہوتے ہیں تو سب سے زیادہ عمر Bristlecone Pine زمرے کے درخت Prometheus کی پائی گئی ہے جو

▲برطانیہ کی نوآبادی سینٹ ہیلینا کا کچھوا جوناتھن جو 176 سال کا ہونے پر بھی تندرست ہے۔ جوناتھن کی زندگی میں 8 شاہی حکمرانوں کی تاج پوشی ہو چکی ہے 50 وزیر اعظم گزر چکے ہیں۔

سائنسی تجربوں سے 4,844 سال ناپی گئی ہے لیکن یہ 5 ہزار سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی کہا جائے تو اس درخت نے کئی تہذیبوں کو مٹتے اور ابھرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ امریکہ میں پایا جانے والے سکویا درخت کی اونچائی ہی نہیں عمر بھی کئی ہزار سال ہو سکتی ہے۔ لیکن لکڑی

کے لالچیوں نے اس درخت کی نسل کو تقریباً ختم ہی کر دیا ہے۔ آج اسے دنیا کے مختلف حصوں میں اگایا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے اب اس سے پہلے کہ اکتاہٹ سے تمھیں نیند اور خراٹے آنے لگیں ہمیں اجازت لینی چاہیے۔ خدا حافظ

افلاطون: خ...خ...خ...خ...خ...خم۔ □

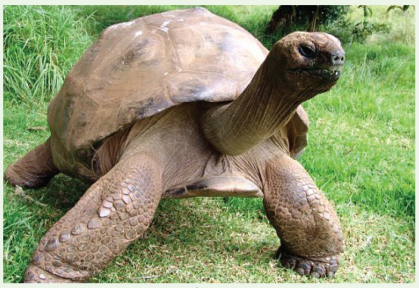

❑ جولز ورنے ▪ مترجم: صفدر حسین

آخری قسط

اسّی دن کا سفر

فرانسیسی مصنف جولز گیبرئیل ورنے Jules Gabriel Verne دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول نگاروں میں شامل ہیں۔ ان کے کئی ناولوں پر فلمیں بن چکی ہیں جن میں اراؤنڈ دی ورلڈ ان ایٹی ڈیز Around the World in Eighty Days بہت مشہور ہوئی۔ یہ ایک ایسے شریف انسان فلیس فوگ Phileas Fogg کی مہم جوئی کا قصہ ہے جو لندن کے ایک کلب میں اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کے ایک ایسے زمانے میں صرف اسّی دن میں دنیا کا پورا ایک چکّر لگانے کی شرط قبول کر لیتا ہے جب ہوائی جہاز اور موٹریں نہیں تھیں اور پانی کے جہاز بھاپ سے چلتے تھے۔اب یہ کہانی اپنے دل چسپ انجام کو پہنچ رہی ہے۔آئندہ شمارے سے ہم ایک نئی کہانی شروع کریں گے۔

اب تک کی کہانی: یہ 1872 کا قصہ ہے۔لندن میں ایک مالدار شخص فلیس فوگ جو وقت، ضابطوں اور قول کا سخت پابند اور شریف انسان تھا ایک بڑے گھر میں تنہا رہتا تھا۔2 اکتوبر کو اس کے نوکر کی شامت آئی تو اس نے مالک کو شیو کے لیے 86 ڈگری کی بجائے 84 ڈگری کا گرم پانی لا کر دے دیا۔فوگ نے اسے نکال کر پاسپرٹو کو ملازم رکھ لیا جو بے وقوف مگر ایماندار اور وفادار تھا۔ اسی روز فلیس فوگ اپنے 'ریفارم کلب' پہنچا تو اس کے دوست تین روز پہلے 29 ستمبر کو بنک آف انگلینڈ میں پڑی ڈکیتی کے بارے میں بات کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اتنی بڑی دنیا میں ڈاکو کو ڈھونڈ پانا ممکن نہیں۔مگر فوگ کا کہنا تھا کہ انسان کی رفتار نے دنیا کو اتنا چھوٹا کر دیا ہے کہ کسی کو ڈھونڈا جا سکتا ہے اور خود وہ صرف اسّی روز میں پوری دنیا کا چکّر لگا سکتا ہے۔اس کا دوست اسٹیوارٹ اور دوسرے لوگ اس پر شرط بدنے کو تیار ہو گئے اور فوگ نے 20 ہزار پونڈ کی شرط قبول کر لی۔ شرط کے مطابق فوگ کو اسی روز 2 اکتوبر بدھ کو سفر پر روانہ ہونا تھا جس کے بعد 21 دسمبر سنیچر کی رات 8 بج کر 45 منٹ تک واپسی پر وہ شرط جیت سکتا تھا۔فوگ اسی رات اپنے خادم پاسپرٹو کو ساتھ لے کر دنیا کے سفر پر نکل پڑا۔ادھر لندن میں اس سفر کی دھوم مچ گئی۔شرط پر عام بحث ہونے لگی۔ کچھ لوگ فوگ کے حامی تھے تو کچھ خلاف۔ خفیہ پولیس کا جاسوس فکس ان کے پیچھے لگ گیا اور پاسپرٹو کو دوست بنا کر فوگ کی جاسوسی کرنے لگا۔سوئیز نہر سے یہ لوگ عدن اور پھر بمبئی پہنچے۔وہاں سے کلکتہ جانے والی ٹرین پر سوار ہوئے تو راستے میں ایک عجیب واقعے نے انھیں روک لیا۔ایک جوان بیوہ عورت کو جو بے ہوش تھی اس کے بوڑھے شوہر کی موت کے بعد زندہ جلانے یعنی ستی کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔فوگ اور پاسپرٹو نے اسے ستی ہونے سے بچا لیا۔اس پڑھی لکھی بیوہ کا نام آؤدا تھا۔وہاں سے وہ طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے، برما، سنگاپور، ہانگ کانگ، چین، اور امریکہ ہوتے ہوئے کسی طرح اپنے سفر کے اسی ویں دن لیورپول پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔اب لندن پہنچنے میں صرف چھ گھنٹے درکار

تھے۔ اسی وقت جاسوس فکس، فلیس فوگ کے پاس آیا۔ گرفتاری کا وارنٹ دکھلا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا، ''ملکہ کے حکم سے میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔''

اس گرفتاری نے فلیس فوگ کے ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ لندن وہ تب پہنچا جب وہ اپنی دانست میں نہ صرف شرط ہار چکا تھا بلکہ کنگال بھی ہو گیا تھا۔ مایوسی کے عالم میں فوگ نے خود کو گھر میں بند کرلیا۔

تبھی ایک حیرت انگیز حقیقت کا انکشاف ہوا اور ایک منٹ میں ساری بازی پلٹ گئی۔ اب پڑھیے اس ناول کی دسویں اور آخری قسط:

فلیس فوگ کی گرفتاری

اگر، کوئی شخص 21 دسمبر کی دوپہر کو لیورپول کے محصول خانہ کے سامنے سے گزرتا تو فلیس فوگ ضرور اسے حوالات میں نظر آتا، لیکن اس کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس کی نظر لگاتار سامنے میز پر رکھی گھڑی پر ٹکی تھی۔ شرط میں ابھی نو گھنٹے باقی تھے۔ لیکن یہ گرفتاری فلیس فوگ کے لئے جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔

اب یہ سمجھنا دشوار تھا کہ فلیس فوگ آخر کیوں پکڑا گیا؟ کیا وہ واقعی بینک کا چور تھا؟ یا پھر ایک ایسا آدمی تھا جس کی زندگی غلط فہمی کی

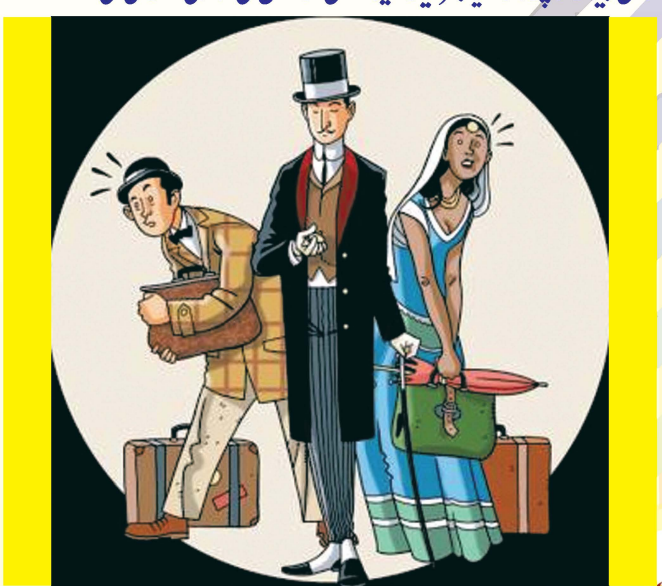

وجہ سے تباہ ہوگئی تھی۔ یہ بڑا پیچیدہ سوال تھا؟ اس کی بے بسی واقعی قابلِ رحم تھی۔ ایسے وقت جب کہ کامیابی اس کے قدم چومنے والی تھی وہ حوالات میں بند پڑا تھا۔

محصول خانہ کے باہر برامدے میں آؤدا اور پاسپرٹو نڈھال بیٹھے تھے۔ دسمبر میں لیورپول میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ لیکن یہ دونوں اس جگہ سے اس وقت تک ہٹنے کو تیار نہ تھے جب تک کہ فلیس فوگ حوالات سے باہر نہ آجائے۔

آؤدا، فلیس فوگ کی گرفتاری کا سبب جاننا چاہتی تھی۔ پاسپرٹو نے لفظ بہ لفظ بینک ڈکیتی کا سارا قصہ اس کو سنایا۔ یہ سن کر آؤدا کو بڑا دکھ ہوا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ جس شخص نے اس پر اتنے احسانات کیے تھے، وہ بھلا بینک کا چور کیسے ہوسکتا تھا؟

پاسپرٹو کی پریشانی بھی بے سبب نہ تھی۔ وہ خود اپنے آپ کو فلیس فوگ کی گرفتاری کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے آقا کو بروقت یہ بتلا دیتا کہ فکس لندن پولیس کا سراغرساں ہے، تاکہ فلیس فوگ بہت پہلے ہی اپنی بے گناہی کو ثابت کرسکتا۔ وقت گزر چکا تھا اور اب انھیں صرف عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

فلیس فوگ حوالات میں بیٹھا اپنی ڈائری میں لکھ رہا تھا۔

'21 دسمبر، سنیچر۔ لیورپول۔ آمد: دن کے 11 بج کر 40 منٹ پر

کل وقت: اسّی دن؟'

وقت گزرتا گیا۔ محصول خانہ کی گھڑی نے دو بجائے۔ اب بھی اگر فلیس فوگ لیورپول جانے والی ٹرین پکڑتا تو وہ 8 بج کر 45 منٹ سے پہلے لندن پہنچ سکتا تھا۔

محصول خانہ کی گھڑی نے جب دو گھنٹے بجائے تو فلیس فوگ کی پیشانی پر ایک لمحہ کے لئے ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔

2 بج کر 22 منٹ پر حوالات کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ فلیس فوگ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے دیکھا کہ سراغ رساں فکس ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بہ مشکل بات کرسکتا تھا۔

ہانپتے ہانپتے اس نے کہا ''جناب مجھے معاف کردیجئے۔ یہ اطلاع ملی ہے کہ اصلی چور تین دن پہلے لندن میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس غلطی کی میں بے حد معافی چاہتا ہوں۔ اب آپ آزاد ہیں مسٹر فوگ۔''

فلیس فوگ بری ہوچکا تھا۔ وہ فکس کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور پھر دو زوردار مکے رسید کردیے۔ فکس فرش پر گر پڑا۔ فلیس فوگ کی زندگی میں بس یہی پہلا موقع تھا کہ اس نے واقعی جلد بازی دکھائی۔

دور سے پاسپرٹو حیرت اور خوشی سے چلا اٹھا ''خوب مارا!''

سراغ رساں فکس فرش پر چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اسے انعام مل چکا تھا۔ دو بج کر چالیس منٹ پر فلیس فوگ، آؤدا اور پاسپرٹو ایک گاڑی میں بیٹھ کر سیدھے لیورپول اسٹیشن گئے۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے، 25 منٹ پہلے ہی اکسپریس ٹرین روانہ ہوچکی تھی۔

بڑی دوڑ دھوپ کے بعد تین بجے فلیس فوگ نے ایک اسپیشل ٹرین کرایہ پر لی اور اس میں آؤدا اور اپنے وفادار ملازم کے ساتھ لندن کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس نے انجن ڈرائیور کو منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ویسے تو ایک تیز رفتار ٹرین ساڑھے پانچ گھنٹے لیورپول سے لندن پہنچ جاتی، لیکن فلیس فوگ کی اسپیشل ٹرین کو راستہ میں جگہ جگہ رکنا پڑا۔ فلیس فوگ جب لندن پہنچا تو شہر کی ہر گھڑی میں 8 بج کر 50 منٹ ہو رہے تھے۔

فلیس فوگ نے ساری دنیا کا سفر تو وقت کے مطابق کیا تھا۔

لیکن اسے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں پانچ منٹ کی دیر ہوئی تھی۔ وہ شرط ہار گیا تھا۔

لندن واپسی

دوسرے دن اگر فلیس فوگ کے پڑوسیوں سے یہ کہا جاتا کہ وہ دنیا کا سفر پورا کر کے لندن واپس آچکا ہے تو کوئی اس بات پر یقین نہ کرتا۔ فلیس فوگ کے گھر کے سارے دروازے کھڑکیاں بند تھے اور پورا گھر سنسان تھا۔

اسٹیشن سے نکل کر فلیس فوگ نے پاسپرٹو کو کھانے پینے کا سامان خریدنے کے لیے بازار بھیجا اور خود آؤدا کو ساتھ لے کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ فلیس فوگ نے یہ بازی کیا ہاری تھی گویا اس نے اپنی پوری زندگی ہی ہار دی تھی اور وہ بھی صرف ایک سراغ رساں کی غلطی کی وجہ سے۔ مکان میں ایک کمرہ آؤدا کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ پاسپرٹو اپنے آقا کے تعلق سے بہت پریشان تھا۔ وہ سارا وقت فلیس فوگ پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو اس صدمے سے وہ خودکشی کر لے۔ رات گزر گئی۔ مگر کیا فلیس فوگ چین کی نیند سو سکا؟ آؤدا ایک لمحہ بھی نہ سو سکی اور پاسپرٹو تو یوں سمجھئے ایک وفادار کتے کی طرح ساری رات اپنے آقا کے کمرے کے باہر بیٹھا نگرانی کرتا رہا۔

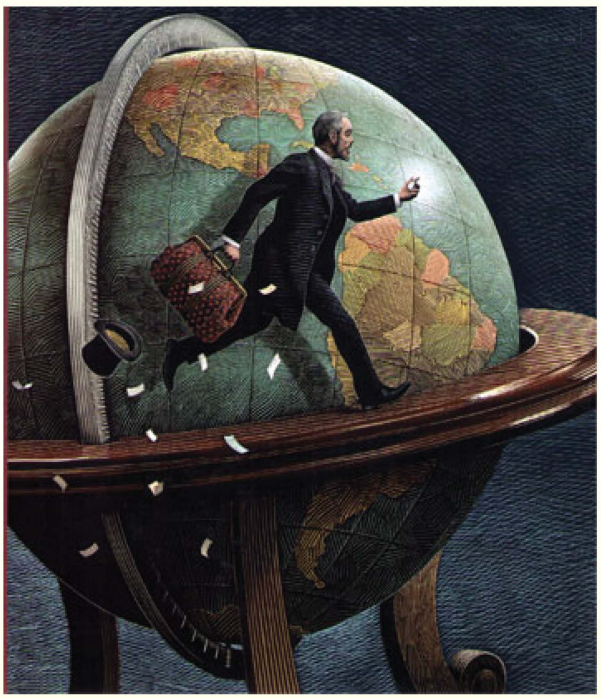

فلیس فوگ کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اتنی ساری مشکلات کا سامنا کر کے، ساری دنیا کا سفر پورا کرنے کے بعد، صرف سراغ رساں کی غلطی کی وجہ سے مقررہ وقت سے صرف پانچ منٹ دیر میں پہنچا تھا اب اس کی ساری پونجی وہ بیس ہزار پونڈ تھے جو بینک میں اس کے نام جمع تھے۔ لیکن وہ بھی چیک کی شکل میں فلیس فوگ 'ریفارم کلب' کے ممبروں کو دے چکا تھا اس طرح وہ اس شرط میں سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔

گھر پہنچتے ہی پاسپرٹو سیدھے اپنے کمرے میں گیا اور فوراً بتی بجھا دی جو مسلسل اسّی دن سے چل رہی تھی۔

صبح سویرے فلیس فوگ نے پاسپرٹو کو بلا کر آؤدا کے لیے ناشتے کا انتظام کرنے کو کہا اور اپنے لیے چائے کی صرف ایک پیالی اور ٹوسٹ لانے کی ہدایت دی۔ اس کے ساتھ آؤدا کو بھی کہلا بھیجا کہ وہ ناشتہ اور رات کا کھانا اس کے ساتھ نہ کھانے پر اسے معاف کر دے کیوں کہ وہ سارا دن کچھ ضروری کاموں میں مصروف رہے گا۔ البتہ اس نے آؤدا کو شام میں ملنے کا وقت دیا۔ سارا دن پاسپرٹو نیچے سے اوپر، اوپر سے نیچے آتا جاتا رہا تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ اس کا آقا کیا کر رہا ہے۔

شام میں ساڑھے سات بجے فلیس فوگ آؤدا کے کمرے میں آیا۔ وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ فلیس فوگ پانچ منٹ تک خاموش بیٹھا رہا پھر آؤدا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''میں جو تمہیں انگلستان لے آیا کیا تم اس کے لئے مجھے معاف کر دوگی۔ میں تمہاری دیکھ بھال کرنا چاہتا تھا لیکن اب تو میرا دیوالہ نکل چکا ہے۔''

آؤدا خود ہی فلیس فوگ کے احسانات کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ اس نے جواب دیا ''دراصل مجھے آپ سے معافی مانگنی چاہیے کیوں کہ آپ کی تباہی کا اصل سبب تو میں ہی ہوں۔ لیکن اب آپ کا

کیا ہوگا؟ آپ تو سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں۔''

فلیس فوگ نے کہا ''اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

آؤدا نے جواب دیا ''مجھے امید ہے کہ ایسے وقت میں دوست تمہاری ضرور مدد کریں گے۔''

''میرا کوئی دوست نہیں۔''

''تو پھر شاید آپ کے رشتہ دار۔'' آؤدا نے کہا۔

''میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔''

آؤدا نے حیرت سے کہا ''کیا ایک بھی ایسا شخص نہیں جو اس مصیبت میں آپ کا ساتھ دے سکے؟ یہ جان کر مجھے بڑا دکھ ہوا کیونکہ تنہائی بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ غم بانٹنے سے غم ہلکا ہوتا ہے۔ ایک کے بجائے دو ہوں تو ہر مصیبت برداشت کی جاسکتی ہے۔''

''ہاں، لوگ تو یہی کہتے ہیں آؤدا،'' فلیس فوگ نے جواب دیا۔

یہ سن کر وہ کھڑی ہوگئی اور پھر فلیس فوگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''مسٹر فوگ کیا آپ مجھے اپنا دوست سمجھیں گے؟ کیا آپ مجھے اپنی بیوی بنانا پسند کریں گے؟''

یہ سن کر فلیس فوگ فوراً کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کرلیں اور پھر آنکھیں کھولتے ہوئے کہا ''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ہاں میں تمھیں چاہتا ہوں، اور اب میں تمھارا ہوں۔''

پھر اس نے فوراً پاسپرٹو کو بلایا۔ پاسپرٹو اندر داخل ہوا تو فلیس فوگ اور آؤدا کو ہاتھ میں ہاتھ لیے کھڑے دیکھ کر وہ فوراً بھانپ گیا۔ اس کے گول چہرے پر نیلی نیلی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ فلیس فوگ نے پاسپرٹو سے پوچھا ''کیا اسی وقت شادی کے لیے پادری کو اطلاع دی جاسکتی ہے؟ یا کل، پیر کے دن۔''

پاسپرٹو نے مسکراتے ہوئے کہا ''نیک کام میں دیر کیسی، ویسے ابھی تو آٹھ بج کر پانچ منٹ ہوئے ہیں۔''

فلیس فوگ نے آؤدا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''کیا کل پیر کا دن ٹھیک رہے گا۔''

آؤدا نے جواب دیا ''ہاں پیر کا دن ٹھیک رہے گا۔''

پاسپرٹو فوراً پادری کا اطلاع دینے کے لیے دوڑ گیا۔

ایک دن کا الٹ پھیر

بینک کا اصلی چور جیمس اسٹرانڈ 17 دسمبر کو ایڈنبرا میں پکڑا گیا تھا۔

فلیس فوگ کے لندن پہنچنے سے تین دن پہلے تک ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ وہی بینک کا چور ہے اور اسے بہر قیمت گرفتار کیا جانا چاہئے۔ لیکن 17 دسمبر کو اصلی چور کے پکڑے جاتے ہی سب کی نظر میں فلیس فوگ پھر ایک نہایت شریف اور ایماندار آدمی بن گیا جو برابر ریل سے جہاز اور جہاز سے ریل میں کودتا پھاندتا دنیا کا سفر پورا کر رہا تھا۔

اصل چور کے پکڑے جانے کی دیر تھی کہ سارے اخبارات میں پھر فلیس فوگ کی شرط کے بارے میں خبریں چھپنے لگیں۔ سارے لندن میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے شرطیں لگانا شروع کردیں۔ پھر وہی پہلا سا جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ لیکن 'ریفارم کلب' کے ممبروں کے حواس باختہ ہوگئے تھے۔ وہ دن رات پریشان رہنے لگے۔

لیکن اس وقت فلیس فوگ کہاں تھا؟ اس کو سفر پر روانہ ہوئے 76 دن ہوگئے تھے۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ آیا وہ زندہ ہے یا چل بسا۔ اس کے بارے میں ایک لفظ بھی

سننے میں نہ آیا تھا۔ تو پھر کیا اس نے دنیا کے سفر کا خیال ہی ترک کر دیا۔ یا پھر یہ ممکن تھا کہ وہ حسبِ وعدہ سنیچر کے دن 21 دسمبر کو رات کے ٹھیک 8 بج کر 45 منٹ پر 'ریفارم کلب' کے اسی کمرے میں واپس آجائے، جہاں سے وہ پورے اسّی دن پہلے سفر پر روانہ ہوا تھا۔

جب کچھ پتہ نہ چلا تو ایشیا اور امریکہ کو تار بھیجے گئے۔ کلب کے آدمی صبح شام اس کے گھر کے چکر لگانے لگے۔ ریس کے گھوڑے کی طرح فلیس فوگ بھی اپنی دوڑ ختم کر رہا تھا۔ لیکن جیسے جیسے شرط پورا ہونے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا، اس کے جیتنے کی رہی سہی امید بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔

سنیچر کے دن 21 دسمبر کی شام لندن کی پال مال سڑک کے آس پاس، دور دور تک لوگ جمع ہو گئے، جہاں اس رات کو فلیس فوگ کے 'ریفارم کلب' واپس آنے کی توقع تھی۔ پولیس ہجوم کو قابو میں رکھنے میں بڑی دشواری محسوس کر رہی تھی۔

'ریفارم کلب' کے اس کمرے میں جہاں فلیس فوگ کو واپس آنا چاہئے تھا، کلب کے پانچوں ارکان موجود تھے۔ جب کلب کی گھڑی نے 8 بج کر بیس منٹ بجائے تو انڈریو اسٹیوارٹ نے ساتھیوں سے پوچھا:

''لیورپول سے آخری ٹرین کب آتی ہے؟''

رائف نے جواب دیا'' 7 بج کر 23 منٹ پر۔ اس کے بعد رات میں بارہ بج کر 10 منٹ تک کوئی ٹرین نہیں آتی۔''

اسٹیوارٹ نے کہا'' اچھا ساتھیو! اگر فلیس فوگ 7 بج کر 23 منٹ کی ٹرین سے لندن آ گیا ہے تو وہ اب تک کلب آ گیا ہوتا۔ اب اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم شرط جیت چکے ہیں۔''

لندن کا ریفارم کلب

ایک ساتھی نے کہا'' لیکن ہمیں آخری وقت تک اس کا انتظار کرنا چاہئے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ فلیس فوگ وقت کا کتنا پابند ہے۔ نہ وہ کبھی وقت سے پہلے آتا ہے اور نہ بعد میں۔ اگر وہ آخری لمحہ پر بھی آجائے تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔''

اسٹیوارٹ نے کہا'' اس وقت اگر میں اسے یہاں دیکھوں تو خود مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔ اب تو وہ یقیناً شرط ہار چکا ہے۔ تم جانتے ہو کہ صرف ایک جہاز 'چائنا' تھا جس سے وہ آسکتا تھا اور وہ کل نیویارک سے آچکا ہے جس میں فلیس فوگ کے نام کا کوئی مسافر نہیں تھا۔ میرا خیال ہے اسے سفر پورا کرنے میں ابھی بیس دن لگیں گے۔''

رائف نے کہا'' ہاں تو یہ صاف ظاہر ہے۔ اب ہمیں فلیس فوگ کا چیک کل بینک لے جانا ہوگا۔''

اسی وقت کلب کی گھڑی نے 8 بج کر 40 منٹ بجائے!

اسٹیوارٹ نے کہا'' پانچ منٹ اور باقی ہیں۔''

پانچوں ساتھی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سب کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ اگرچہ وہ اپنی پریشانی کو چھپانے کے لیے تاش کھیلنے بیٹھ گئے لیکن ان کا سارا دھیان صرف گھڑی کی

طرف تھا۔ایک ساتھی نے کہا ''9 بجنے میں 17 منٹ باقی ہیں۔''

اسٹیوراٹ نے کہا ''میں تو اپنے حصہ کا ایک پونڈ بھی نہیں چھوڑوں گا۔ پورے چار ہزار پونڈ لوں گا۔''

کلب کے مطالعہ کے کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔کلب کے باہر راستوں پر عوام کی کھسر پھسر میں کبھی کبھی خوشی کے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے۔

''آٹھ بج کر 44 منٹ!'' جانسلین نے کہا ''بس ایک منٹ گزرا اور سمجھو ہم شرط جیت گیے۔'' اب سب آخری منٹ کا ایک ایک سکنڈ گننے لگے۔ چالیسواں سکنڈ بھی گزر گیا۔ پچاس واں بھی گزر گیا۔

8 بج کر 44 منٹ اور 55 سکنڈ پر کلب کے باہر سڑک پر چیخ پکار کے ساتھ تالیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔کلب کے ارکان فوراً اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بے تحاشہ دروازے کی طرف دوڑے۔ 57 ویں سکنڈ پر مطالعہ کے کمرے کا دروازہ کھلا۔کلب کی گھڑی ابھی 60 واں سکنڈ بھی نہ بجانے پائی کہ فلیس فوگ اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے ہی لوگ تالیاں بجاتے ہوئے کلب میں گھس پڑے۔ فلیس فوگ نے اپنے روایتی انداز میں نہایت اطمینان سے کہا:

''ساتھیو! میں آ گیا ہوں۔''

شادی خانہ آبادی

بے شک، وہ فلیس فوگ ہی تھا۔

21 دسمبر، سنیچر کی رات 8 بج کر 5 منٹ پر فلیس فوگ نے پاسپرٹو کو پیر کے دن، شادی کا وقت مقرر کرنے کے لیے پادری کے پاس بھیجا تھا۔ پاسپرٹو اچھلتا کودتا پادری کے مکان پر گیا اور وہاں بیس منٹ تک انتظار کرتا رہا۔لیکن 8 بج کر 35 منٹ پر وہ پادری کے مکان سے سرپٹ دوڑتا گھر پہنچا۔ ہوا میں ایک قلابازی لگائی اور فلیس فوگ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔سانس اس کے سینے میں نہیں سما رہی تھی۔

فلیس فوگ نے پوچھا ''آخر بات کیا ہے؟''

''شادی کل نہیں ہو سکتی۔ ہرگز نہیں۔ ناممکن ہے۔''

''کیوں؟ ناممکن کیوں؟''

''کیوں کہ کل اتوار ہے۔''

''کل تو پیر ہے۔'' فلیس فوگ نے کہا۔

''نہیں نہیں آج سنیچر ہے۔'' پاسپرٹو نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کی سانس ابھی تک بھول رہی تھی۔

''سنیچر؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''ہاں ، ہاں، ہاں!'' پاسپرٹو چلایا ''ہم نے دنوں کے حساب میں ایک روز کی غلطی کی ہے ہم چوبیس گھنٹے پہلے ہی لندن پہنچ گئے تھے۔ اب صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔''

پاسپرٹو نے ہاتھ پکڑ کر فلیس فوگ کو کمرے سے باہر کھینچا۔ فلیس فوگ کے پاس ان باتوں پر غور کرنے کے لئے وقت ہی کہا تھا؟

گرین وچ آبزرویٹری کی گھڑی

گھر سے باہر نکلا اور اچک کر ایک گاڑی پر سوار ہو گیا، کوچوان کو ایک سو پونڈ دینے کا وعدہ کیا۔ فلیس فوگ کی گاڑی راستہ میں تین کتوں کو کچلتی اور چار گاڑیوں سے ٹکراتی ہوئی 'ریفارم کلب' پہنچ گئی۔ جس وقت وہ کلب میں داخل ہوا تو کلب کی گھڑی 8 بج کر 44 منٹ 57 سکنڈ بجا رہی تھی۔

فلیس فوگ نے واقعی اسّی دن میں دنیا کا سفر پورا کر لیا اور اس طرح وہ بیس ہزار پونڈ کی شرط جیت گیا۔لیکن اب سوال یہ تھا کہ ایک ایسا شخص جو وقت اور اصولوں کا حد درجہ پابند تھا بھلا وہ ایک دن کی غلطی اپنے حساب میں کیسے کر سکتا تھا؟

سچ یہ تھا کہ انگلستان سے روانگی کے 79 ویں دن یعنی 20 دسمبر جمعہ کے روز ہی لندن پہنچ گیا تھا جب کہ اسے 80 ویں دن یعنی

21 دسمبر سنیچر کو لندن پہنچنا چاہئے تھا۔ آخر اس نے ایسی کیا غلطی کی؟ دنوں کی گنتی میں ضرور الٹ پھیر ہوئی ہوگی۔

فلیس فوگ نے دوبارہ غور کیا تو جواب بالکل آسان نکلا۔

دراصل اس نے لندن یعنی گرین وچ مشاہدہ گاہ Observatory کے اس مقام کے بالکل نیچے واقع لندن شہر سے اپنا سفر شروع کیا تھا جہاں سے عالمی وقت کی شروعات کو صفر سے ناپا جاتا ہے اور جس کے پار کرتے ہی دن بدلتا ہے۔ فلیس فوگ صفر درجہ سے مسلسل مشرق کی جانب سفر کر رہا تھا، اور زمین مشرق کی ہی طرف گھومتی ہوئی چوبیس گھنٹوں میں ایک دن پورا کرتی ہے۔ اس چکّر کو 360 ڈگری میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر ڈگری چار منٹ کی ہوتی ہے۔ اس لیے جیسے جیسے وہ ایک ایک ڈگری پار کرتا گیا خود بہ خود وقت میں چار چار منٹ کی کمی ہوتی گئی۔ اس طرح 360 ڈگری والے پورے کرۂ زمین پر چکر لگا کر اس نے 1440 منٹ یعنی پورے 24 گھنٹوں کی بچت کر لی تھی۔ اور یوں وہ ایک دن پہلے ہی لندن پہنچ گیا تھا۔ اس کے برعکس اگر وہ زمین کے گھومنے کی سمت کے الٹ اپنا سفر شروع کرتا یعنی لندن سے نیویارک اور پھر جاپان، ہندوستان وغیرہ ہوتے ہوئے لندن واپس آتا تو شرط سے ایک دن بعد سفر مکمل کرتا۔

خیر، اس مہماتی سفر میں فلیس فوگ نے 19 ہزار پونڈ خرچ کیے اور جو ایک ہزار پونڈ بچ رہے تھے وہ اس نے اپنے وفادار ملازم پاسپرٹو اور منحوس سراغ رساں فکس میں آدھے آدھے بانٹ دیے۔

فلیس فوگ نے 500 پونڈ بطور انعام پاسپرٹو کو دے دیے لیکن اس میں سے گیس کا وہ خرچ ضرور کاٹ لیا جو اس کی غفلت سے 19000 گھنٹے اور 20 منٹ تک جلتی رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ ایک بااصول آدمی تھا۔

اسی رات فلیس فوگ نے آؤدا سے پوچھا ''اب تو تم مجھ سے شادی کر کے خوش رہ سکوں گی نا؟''

آؤدا نے جواب دیا ''یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہئے۔ تم قلاش ضرور ہو گئے تھے لیکن اب مالدار ہو۔''

''نہیں یہ ساری دولت اب تمہاری ہے۔'' فلیس فوگ نے کہا ''اگر تم شادی کا ارادہ نہ ظاہر کرتیں تو پاسپرٹو پادری کے پاس نہ جاتا اور مجھے بروقت اپنی غلطی معلوم نہ ہوتی اور...''

''پیارے مسٹر فوگ...'' آؤدا نے بات کاٹ کر اسے بانہوں میں لے لیا۔ 48 گھنٹے بعد شادی کی رسم ادا کی گئی۔ پاسپرٹو نے دلہن کو دولہا کے حوالے کیا دوسرے دن صبح سویرے ہی آقا کے سونے کے کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکانے لگا۔ فلیس فوگ نے دروازہ کھول کو پوچھا ''کیا بات ہے، پاسپرٹو؟''

''جناب! مجھے بیٹھے بیٹھے یہ خیال آیا کہ...''

''کیا خیال آیا؟''

''کہ ہم صرف 68 دن میں دنیا کا سفر کر سکتے تھے۔''

''بے شک، اگر ہم ہندوستان نہ جاتے۔ لیکن تب ہم آؤدا کو نہیں بچا سکتے تھے اور آج وہ میری بیوی بھی نہ ہوتی۔''

واقعی اس نے سچ کہا تھا! اسّی دن میں دنیا کے سفر کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا تھا! □

قومی اردو کونسل نے اس مشہور ناول کا مختصر ایڈیشن کتابی شکل میں چھاپا ہے جس کی قیمت صرف 20 روپے ہے۔ اسے آپ شعبہ فروخت سے منگا سکتے ہیں جس کا پتہ ای میل آئی ڈی اور فون نمبر شمارے کے پہلے صفحے پر دیے گئے ہیں۔ مدیر

Back Inner Cover

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیاتِ ماجدی (جلد اوّل)

ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 666
قیمت: -/196 روپے

کلیاتِ سجاد ظہیر (جلد اوّل)

مرتبین: نجمہ ظہیر باقر، علی باقر
صفحات: 388
قیمت: -/146 روپے

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت

مرتب: خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 493
قیمت: -/166 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد اوّل)

مرتبہ: امتیاز وحید
صفحات: 354
قیمت: 118 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد دوم)

مرتبہ: امتیاز وحید
صفحات: 368
قیمت: 133 روپے

قانون

ادارہ
صفحات: 440
قیمت: -/136 روپے

متاعِ فن

مرتب: عبدالحق
صفحات: 403
قیمت: -/131 روپے

علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات

مصنف: خوشتر نورانی
صفحات: 248
قیمت: -/91 روپے

تاریخ ادب اردو جلد یازدہم

مصنف: محمد انصار اللہ
صفحات: 540
قیمت: -/164 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد اوّل حصہ اوّل)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 453
قیمت: -/151 روپے

یونانی ادویہ مفردہ

مصنف: حکیم سید صفی الدین علی
صفحات: 365
قیمت: -/85 روپے

فغانِ دہلی

مصنف: تفضل حسین کوکب
صفحات: 111
قیمت: -/70 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد اوّل حصہ دوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 454 تا 896
قیمت: -/140 روپے

ڈکشنری (حصہ اول و دوم)

ادارہ
صفحات: (802+318)
قیمت: -/522 روپے

تعلیمی نفسیات

مصنف: طلعت عزیز
صفحات: 242
قیمت: -/96 روپے

پودحفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال

مترجم: سید ظفر الاسلام
صفحات: 78
قیمت: -/64 روپے

ہمارے جسم کا معجزاتی نظام

مصنف: قیصر سرمست
صفحات: 216
قیمت: -/41 روپے

حسن نعیم اور نئی غزل

مصنف: احمد کفیل
صفحات: 284
قیمت: -/104 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

Front Inner Cover

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھئے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھئے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com